انشائے بے خبر

(مقدمہ)

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

ملنے کا پتہ

ادبی دنیا، ڈگی روڈ، علی گڈھ

کتابت - - - احمد علی
تعداد - - - ایک ہزار
سن - - - - ۱۹۶۰ء
مطبع - - - سود پریس دلّی
قیمت - - - ایک روپیہ

ناشر
ادبی دنیا، ڈگی روڈ، علی گڑھ

فہرست

خواجہ غلام غوث بے خبر

خواجہ حضور اللہ کے بیٹے خواجہ غلام غوث تخلص بے خبر ۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸ شوال المکرم ۱۳۲۲ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت کی۔ آپ کا خاندان علم و فضل میں ممتاز تھا۔ یہ خاندان (لاسہ) تبت اور نیپال کے علاقے سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا، اور بنارس میں آباد ہو گیا۔ بے خبر یہیں سن شعور کو پہنچے، علوم عربی و فارسی کی تکمیل بھی آپ نے بنارس ہی میں کی۔

بے خبر کے خالو سید محمد خاں، لفٹنٹ گورنر صوبہ شمالی و مغربی کے میر منشی تھے۔ جب ۱۸۴۰ء میں ان کو پنشن ملی تو خواجہ صاحب کا تقرر بعمر ۱۹ سال اسی عہدے پر ہوا اور ۴۵ سال (۱۸۸۵ء) تک آپ نے میر منشی کے فرائض انجام دیے۔ اس مدت میں مختلف عنایات و خطابات سے سرفراز ہوتے رہے اور اپنی اعلیٰ خدمات کے صلہ میں سرکار برطانیہ سے "خان بہادر ذو الفقار" کا خطاب بھی پایا۔

میر منشی کے عہدے کی ذمہ داریوں کے باوجود بے خبر ادبی و علمی مشاغل میں مصروف رہتے تھے۔ شعر و ادب کی اصلاح کا خیال رکھتے۔ زمانے کے بدلتے ہوئے مزاج کا اندازہ کرتے تھے ———— اور زبان و ادب کی خدمت اس نہج پر کرنے کے لئے اپنے ذہن کو تیار کرتے چنانچہ آپ کی شعری صلاحیت و رجحانات کے سلسلے میں غالب نے یہ اظہار کیا تھا۔ "........ رام پور میں ہی تھا کہ اودھ اخبار میں حضرت کی غزل نظر افروز ہوئی، کیا کہنا ہے انداز اس کو کہتے ہیں، جدت طرز

اس کا نام ہے، جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا وہ تم بروئے کار لائے، خدا تم کو سلامت رکھے......"

[اردوئے معلی]

بے خبر عمر میں غالب سے چھوٹے تھے، لیکن ذہن رسا پایا تھا۔ اردو کے اچھے نغز گو شاعر تھے، ویسے شعر و شاعری کا ذوق کچھ فطری تھا اور کچھ ماحول نے پیدا کر دیا تھا۔ تذکروں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ۱۸۴۶ء سے قبل اُردو نثر کی جانب متوجہ ہو چکے تھے، روشِ عام سے ہٹ کر نثر کو آسان اور سادہ بنانے میں ان کا ہاتھ ہو یا نہ ہو مگر اس روش کی تبدیلی اور اس کے رواج دینے والوں میں ان کا شمار ضرور ہے۔ ورنہ اردو نثر میں جو سادگی اور پرکاری آج نظر آ رہی ہے، اگر اس عہد میں تبدیلی کی ابتدا نہ کی جاتی تو ممکن ہے ایک طویل مدت تک اس صنف میں کسی طرح کی کوئی تبدیلی رونما نہ ہوتی ——— اسی طرح اس رائے سے اتفاق ممکن نہیں کہ مرزا غالب کی نثری تحریروں سے قبل بے خبر کے جو نثری شہ پارے ملتے ہیں ان سے ان کو تقدم کا شرف حاصل ہے۔ اس کا...... سبب یہ ہے کہ غالب کی تحریریں بھی اس زمانے سے ملتی ہیں اور ان میں سادگی و پرکاری کا وہی جوہر موجود ہے، القاب و آداب کی بے نیازی کا وہی انداز ہے جو بعد کے خطوط میں ملتا ہے۔ بے خبر نے بھی اپنے خطوط میں یہ التزام رکھا ہے، اس لئے یہ بات ٹھیک ہے کہ دونوں کے ذہن نے ایک ساتھ اور ایک وقت میں مروجہ نثر کو تبدیل کرنے کی ضرورت کا احساس کیا اور عملی قدم اٹھایا۔ ویسے بے خبر پر بیدل اور فارسی شعراء اور ان کے ادب کا بے حد اثر ہے، جس نے زبان کو ثقیل دبا رکھا ہے، اس کے باوجود ان کی تحریروں میں جا بجا شوخی کی جھلک، قوس و قزح کا رنگ، زبان کی فصاحت اور لچک، خیال کی وسعت آفرینی، اور انشاء پردازی مکمل صورت میں موجود ہے۔

خود غالب جو ان کے ہم عصر اور دوست تھے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"........ زمرۂ خواص میں عوام کا شمار نہیں، دو مخلص صادق الولا دیکھئے، ایک مولوی سراج الدین رحمۃ اللہ علیہ دوسرا منشی غلام غوث سلمہ اللہ العلی العظیم ...."

اس خط کے لہجے اور انداز سے غالب کے خلوص اور تصنع دونوں کا اظہار ہوتا ہے، اس کے ساتھ بے خبر کی علمیت اور ادبی شخصیت میں چار چاند بھی لگ جاتے ہیں ان کے ادبی مزاج کو سمجھنے، ان کی علمی حیثیت کا اندازہ کرنے اور سماجی شخصیت کا تجزیہ کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ دراصل زبان کا مسئلہ بڑا نازک ہے، عام بول چال اور تحریر و تقریر کی زبان میں جو فرق ہے، وہی فرق ایک صاحب طرز ادیب اور غیر ادیب میں ہوتا ہے، پھر یہ ضروری نہیں کہ ہر ادیب اسی سوجھ بوجھ سے کام لے جو وقت کا تقاضا ہو ——— لیکن بے خبر نے اپنی بصیرت اور ذہنی ادراک سے زبان کا جائزہ لیا، اقدار کو پرکھا اور نئے عزم و حوصلے کے ساتھ راستے کی ناہمواری کو خیال میں نہ لاتے ہوئے، ادب کی خدمت کی، یہ ایک حوصلہ مندانہ کام تھا جس نے پورے ادب کو متاثر کیا، ورنہ میر جیسے آسان اور سہل نگار شاعر کی جو تحریریں ملتی ہیں ان میں کوئی نمونہ اردو خط یا اردو نثر کا نہیں ہے، حتیٰ کہ میر کی آپ بیتی بھی فارسی زبان کی مرہونِ منت ہے۔

انشائے بے خبر، خواجہ غلام غوث بے خبر کے ان خطوط اور مقدمے وغیرہ کا مجموعہ ہے جو انھوں نے اپنے دوستوں، ساتھیوں اور عزیزوں کو لکھے ——— اس مجموعہ میں جو خطوط درج ہیں ان کا انداز نگارش اگرچہ انیسویں صدی کے اول کی نگارشات کی طرح ہے اور اس پر دور سرسید کے پہلے کے مکاتیب و تحریر کا اطلاق ہوتا ہے مگر مجموعی حیثیت سے انشاء پردازی کے نئے اسلوب اور جدید رجحانات کا میلان

بھی ملتا ہے، اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ بے خبر کی مزید تحریریں تلاش کی جائیں، ان کے خطوط کی چھان بین کی جائے، سنہ اور تاریخ کا صحیح تعین کیا جائے، اسی طرح بے خبر کی شعری صلاحیت کو اجاگر کیا جائے، ان کے علمی اور قومی کارناموں کو منظر عام پر لایا جائے۔

بے خبر کی جملہ تصانیف مندرجۂ ذیل ہیں:-

خونابۂ جگر	فارسی رقعات و نظم	
فغانِ بے خبر	اردو رقعات و نثر	۱۸۹۱ء سال طبع
رشکِ لعل و گوہر	بقیہ مجموعہ نظم و نثر	۱۹۰۸ء سال طبع

انشائے بے خبر ——— عرصہ سے کمیاب تھی، جناب خواجہ احمد فاروقی کی عنایت سے ایک پرانا اور بوسیدہ نسخہ ملا، جو ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں میری تمنا تھی کہ بے خبر کے کچھ اور خطوط مل جاتے تو اس مجموعہ میں شامل کر دیتا، جہاں جہاں اس کے متعلق دریافت کر سکتا تھا، کیا، مگر کامیابی نہ ہوئی۔

سید مرتضیٰ حسین بلگرامی

اکبرآباد

۳۰ ستمبر ۱۹۶۰ء

انشائے ہنجبر

کا

دیباچہ

مذاق درد کے آشنا جو نوک نشتر کو تصورِ مژگاں دلدار کی طرح دل میں ڈوبا رہنا عزیز رکھ کے اُس کی علیحدگی پسند نہیں کرتے لذت زخم کے تشنا سا جو آبِ شمشیر کو شربتِ دیدار کے مانند آبِ بقا سمجھ کے ذہنِ تمنا بند نہیں کرتے خوب جانتے ہیں کہ جب آتش گل عین بہار میں آشیانے میں آگ لگائے تو بلبل نوحہ سرائی میں مجبور ہے اور جب ساقی بے رحم سرِ محفل صراحی کا خون جگر اس کے منھ سے اگلوائے تو نالۂ قلقل کا بلند ہونا ضرور ہے۔ آبشار کا سر جب پتھر سے ٹکرائے تو پھر وہ کیونکر نہ چلّائے، نے کے ناسور سینہ پر جب ناخن زنی ہو تو وہ کس طرح شور شیون نہ سنائے، بیمار کراہنے سے باز رہے اس جبر پر آہ سے کب اختیار ہے جس کے دل پر چوٹ ہو اس کی زبان فغاں نہ کرے بہت دشوار ہے۔ جب یہاں کا یہی دستور ہے پھر ہنجبر کا کیا قصور ہے۔ اگلے فغانوں کے بعد وہ کیونکر فغاں نہ کرتا کیا چپ رہ کر دل ہی دل میں گھٹ گھٹ کر مرتا مجموعۂ فغانِ ہنجبر چھپنے کے بعد وہ اپنی عادت سے باز نہیں آتا فغاں کرتا ہی اور ان اوراق پر اس کی تصویر کھینچتا ہی اگر قضا نے اتنی مہلت دی کہ یہ مجموعہ بھی مجموعہ اول کے حد کو پہنچا تو یہ اُس کا ثانی ہوگا ورنہ یہ بھی اُسی میں شامل کر دیا جائے گا۔ اختتام پر یہ شعر حضرتِ بیدل کا داخل کر دیا جائیگا۔

افسانہا بہ بستن مژگاں تمام شد　　کوتاہی امل بہ ہمیں عقدہ بند بود

ہنجبر

مولانا غلام امام شہیدؒ

قبلہ! میری شوخی دیکھئے! یوسف کو آئینہ دکھاتا ہوں۔ خورشید کو روشنی کی حکایت سناتا ہوں۔ گلزار میں پھول لے جاتا ہوں۔ ختن میں مشک تحفہ بھیجتا ہوں۔ دریا کے سامنے روانی کے معنی بیان کر رہا ہوں۔ چاند کے روبرو نور افشانی کا معما حل کرتا ہوں۔ لعل کے روبرو میں رنگ کی دوکان کھولتا ہوں۔ قند کے مواجہ میں شیرینی تولتا ہوں۔ مسیحا سے کہتا ہوں جان بخشی کی روایت سنیئے۔ موسیٰ سے تمنا کرتا ہوں کہ ید بیضا کی چمک دیکھئے۔ یعنی حضرت کا دیوان مرتب کر کے آپ کے حضور میں پیش کرتا ہوں۔ میرے لئے اس کے دیباچہ لکھنے کا ارادہ کرنا ایسا تھا۔ جیسے ایک فقیر شاہی خزانوں کے اہتمام کا قصد کرے۔ ایک شیشہ گر ہیرا تراشنے کی آرزو میں مرے! اندھا چاہے کہ قدرت کے نظارے سے حظ اٹھائے! گونگا چاہے کہ فصاحت کا سکہ بٹھائے! اگرچونکہ غلبۂ شوق میں تمیز باقی نہیں رہتی۔ یہ خیال نہیں ہوتا۔ کہ میں کیا ہوں۔ اور کیا کرتا ہوں، دیباچہ بھی لکھ ڈالا۔ وہ اس کے قابل تو کاہے کو ہے۔ آپ کے دیوان پر میرا دیباچہ ایسا ہے۔ جیسے موتی کی لڑی میں سنگریزے کا آویزہ لگا ہو۔ یا زربفت کے قبا میں جھینٹ کا حاشیہ لگا ہو۔ مانی کی تصویر کے گرد ایک نومشق لکیریں بنا دے۔ سحبان کے کلام کی ایک ابجد خواں شرح لکھ دے۔ مگر اس نظر سے کہ ہر چیز اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ بدصورت کے مقابلہ میں حسین کے حسن کو رونق ہوتی ہے۔ شب تار میں شمع کی روشنی زیادہ ضیا دیتی ہے۔ کھاری پانی پینے کے بعد قند کے شربت میں اور ہی مزا آتا ہے۔ صحرا نوردی کے بعد باغ کی سیر کا لطف کہا نہیں جاتا ہے۔ خاطر مشکل پسند پسند کرے۔ تو ہو سکتا ہے۔ بیشک دیکھنے والوں کو اس کی خوبی زیادہ دکھا دے گی۔ ستارہ دیکھ کے جو چاند دیکھے۔ اسے روشنی زیادہ نظر آئے گی۔ میری خوش طالعی ہے

اگر یہ قبول ہو۔ اس کے لئے شرف ہے۔ اگر دیوان میں داخل ہونے کی عزت اسے حصول ہو۔

نواب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

حضرت۔ نسخہ عود ہندی کا ممتاز علی خاں صاحب کی فرمائش سے مرتب ہو رہا ہے۔ چودھری عبد الغفور صاحب کے پاس سے آپ کے خطوط اور ان کا دیباچہ آ گیا ہے۔ میں نے سوائے اس کے کہ آپ سے بہت کچھ حاصل کیا، کالپی اور لکھنؤ اور بریلی اور گورکھپور اور اکبر آباد سے آپ کی تحریریں فراہم کیں خود سب کو دیکھا جو مضامین لائق اعلان کے نہ تھے ان کو نکال ڈالا کاتب لکھ رہا ہے۔ میں مقابلہ کرتا ہوں اب تک بڑے ورقوں کے دس جزو مرتب ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ اُدھر کا گشت کا آغاز ہو اِدھر اس مجموعہ کا انجام ہو۔ میں اپنے حق سے ادا ہوں، چھپوانے کے لئے ان کے حوالے کروں اس وقت بھی مقابلہ میں مصروف ہوں، پڑھتے پڑھتے آپ کو لکھنے کا خیال آیا کہ نواب مصطفےٰ خاں صاحب شیفتہ، منشی حبیب اللہ صاحب ذکا۔ میاں داد خاں صاحب سیاح ان حضرات کے پاس بھی آپ کے رقعات ضرور ہوں گے آپ انھیں ایما کریں کہ جس کے پاس جو کچھ ہو بسبیل ڈاک میرے پاس بھیج دیں۔ رام پور میں تو میں نے خود لکھا ہے، شاید وہاں سے بھی کچھ آ جائے جب تک کتاب تمام ہو اور جس قدر خطوط ہاتھ آویں اور اس میں شامل ہوں غنیمت ہے۔"

دیگر

جناب عالی۔ میں نے ایک عریضہ اس سے پہلے آپ کو بھیجا ہے اس میں

یہ مطلب جواب طلب لکھا ہے کہ مولوی صاحب جہانگیر نگری نے جو رسالہ (موید برہان) تصنیف کیا ہے (قاطع برہان کے جواب میں) اس کا نام کیا ہے؟ اور وہ کہاں چھپا ہے؟ آج تک جواب نہیں۔ کیونکر مجھے حیرت نہ ہو، جب ترک جواب حضرت کی عادت نہ ہو، جواب عنایت کیجیے مجھے بلائے انتظار سے نجات دیجیے۔ الحمدللہ کہ عود ہندی کی ترتیب تمام ہوئی جلد مند ھوا کر آج منشی ممتاز علی خاں صاحب کی خدمت میں روانہ کردی اب چھپواتے ہیں دیر کریں یا جلدی انھیں اختیار ہے۔

نیتجیر

نواب غلام دستگیر خاں حیدر آبادی

اللہ اللہ ایسے ناپرسی اور ناقدری کے زمانے میں کہ آفتاب کو ذرّہ، دریا کو قطرہ گل کو خار، اکسیر کو خاک جواہرات کو پتھر موتی کو سیپ سونے کو تانبا، چاندی کو پارہ چاند کو تارا کے برابر بھی لوگ نہیں جانتے۔ ایسے جوہر شناس اور قدردان بھی ہیں جو ذرّہ کو آفتاب، قطرہ کو دریا خار کو گل خاک کو اکسیر پتھر کو جوہر سیپ کو گوہر تانبا کو سونا پارہ کو چاندی تارہ کو چاند کے مساوی مانتے ہیں۔ سچ ہے ایسے ہی لوگوں سے زمانہ قائم ہے۔ آپ میری اور میری تصنیف کی تعریف فرماتے ہیں اور میں خجالت سے پانی پانی ہوا جاتا ہوں، حیرت کے دریا میں ڈوبا جاتا ہوں گو کہ میری اس ہیچمدانی پر تو یہ افراطِ قدردانی ہے اگر بفرضِ محال مجھے کچھ آتا ہوتا تو کیا ہوتا، آپ اپنی کثرت عنایت سے جو چاہیں فرمائیں میں تو اپنے کو ہیچ سے نسبت دیتے ہوئے بھی شرماتا ہوں اور ڈھونڈھتا ہوں کہ کوئی ایسا لفظ ملے جو ہیچ سے بھی زیادہ ہیچ ہو تو اس سے اپنے کو تعبیر کروں، یہ کیا ارشاد ہوا کہ تم جو اپنے کو فقیر لکھتے ہو اس کو میں تعلّی سمجھتا ہوں۔ اس لفظ سے زیادہ تو کوئی انکسار کا لفظ نہیں ہے پھر اس سے تعلّی کیوں کر مفہوم ہوتی ہے غالباً الفقر وفخری کی طرف خیال جاتا ہوگا وہ اور مقام ہے مجازاً فقیر مفلس اور نادار کو کہتے ہیں میں اسی معنی میں اپنے کو فقیر لکھا کرتا ہوں، نہ اس معنی پر اس سے زیادہ ناداری کیا ہوگی

کہ یہاں کی کوئی چیز اپنی نہیں سب عاریتی ہیں چند روز جو اس مسافر خانہ میں ٹھہرا ہوں میرے پاس ہیں یہاں سے چلا جاؤں گا کسی اور کو مل جائے گی یہاں سے جہاں جاؤں گا وہاں کے لئے کچھ سرمایہ پاس نہیں محض تہیدست پھر مجھ سے زیادہ مفلس کون ہوگا اور کیوں پنہ کو فقیرانہ کہوں جن عنایت فرمانے فغاں تجبیر کو لوگوں کے کانوں تک پہنچایا تھا اب انھوں نے خونابہ جگر کو زنگ طبع دیا جو میرے فارسی نظم ونثر کے مجموعہ کا نام ہے چونکہ ہفتہ عشرہ میں تمام ہوجانے والا تھا میں نے عنایت صحیفہ کے جواب عرض کرنے میں اس کے تمام ہونیکا انتظار کیا چنانچہ وہ اختتام کو پہنچا اور آج اس کی ایک جلد خدمت عالی میں روانہ کی کہ میری نادانی کے دو گواہ آپ کے حضور میں پہنچیں اور اس کی تصدیق کامل ہوجائے ایک کی سیر سے تو آپ تضیع اوقات کر چکے اب اس کو ملاحظہ فرما کر یہ زبان پر لائیے

تو کار زمیں را نکو ساختی   کہ با آسماں نیز پرداختی

مولوی محمد روح اللہ منصف بسولی

اتنی مدت میں ملا مجھ سے وہ دھوکھا دیکر   یاد بھی جب مجھے اس شوخ کی صورت نہ رہی

اللہ اکبر اتنی مدت میں آپ نے مجھے یاد کیا کہ میں اس راہ ورسم ہی کو بھول گیا تھا خط جو آیا تو دیر تک حیرت زدہ اسے دیکھتا رہا کہ کس کا خط ہے اور کاتب اس کے کون بزرگ ہیں جب کچھ خیال میں نہ آیا تو فہرست اسماء احباب میں جو صفحہ دل پہ لکھی ہوئی ہے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے آپ کا اسم گرامی نکلا اس کے پڑھنے نے دل کے ساتھ وہ کام کیا جو اعجاز عیسیٰ مردہ کے ساتھ کرتا تھا۔ ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ آپ کا خط ہے عقل نے کہا خدا خدا کرو، انھوں نے کبھی اور بھی لکھا ہے کہ اب لکھنے کئی دفعہ ردّ و بدل کرنے کے بعد میں نے خط کھول ڈالا جب کھولا تو یہ کھلا کہ آپ ہی بر سر لطف واحسان آئے ہیں اب تک سوچتا تھا کہ شکریہ کیسے لکھوں آپ کو جنھوں نے ایک عمر کے بعد یاد فرمایا یا فرزند دلبند

حافظ خواجہ احمد حسین کو جو باعث اس یادآوری کا ہوا آخر رائے نے اس پر قرار پکڑی کہ جو اس سے شکر گذاری ہی کیا آپ ہی کا سپاس ادا کروں کہ وہ آیندہ کے لیے بھی کام آئے گا یادآوری کے استحقاق کی بنا کو قائم کرے گا جو نعمت ایک عمر کے بعد ملے اس کے شکر ادا کرنے کو بھی ایک عمر چاہیے وہ کہاں سے ہاتھ آئے اس لیے اعتراف عجز سے اس مرحلہ کو طے کرتا ہوں، درحقیقت میں اس کا ممنون ہوں کہ میری جگہ آپ کے دل میں تھی جو آخر کار اس نے مجھے یاد دلایا اگر نہ ہوتی تو کیوں یاد آتا، فرزند عزیز کے وہاں جانے سے جہاں آپ ہیں مجھے بڑی تقویت ہوئی یقین ہے کہ آپ کسی طرح مجھ سے کم اس کے ساتھ محبت نہ کریں گے، خدا کرے اب آپ مجھے بھول نہ جائیں اور کبھی کبھی تو یاد فرمائیں۔

مولوی ولی محمد وکیل منصفی شاہ آباد

از حالِ دل ندانم آنکہ کرد اورا   من خود نہ رفتم آنجا فریاد رفتہ باشد

فریاد رس حقیقی کا شکر ہے کہ فغانِ بےخبر کی خبر آپ تک پہنچی اور اس کے سننے اور خونابۂ جگر کے رنگ دیکھنے کا آپ کو ایسا شوق ہوا کہ ایک عمر کے بھولے ہوؤں کو آپ نے یاد کیا میں تو جانتا تھا ؎

کون سنتا ہے فغانِ بےخبر   دیکھتا ہے کون خونابِ جگر

مگر معلوم ہوا کہ نہیں ابھی گوش شنوا اور دیدۂ بینا باقی ہیں کل ایک ایک نسخہ دونوں کا روانہ کیا ہے صرف پہنچ جانے کی اطلاع چاہتا ہوں، اس غرض سے کہ ڈاک میں تلف ہونے کا کھٹکا دل سے جاتا رہے۔

منشی امین الدین خاں

لطف فرمایمن۔ الطاف نامہ کے پہنچنے نے مجھ کو ممنون افراط محبت اور

دل کو سرشارِ بادۂ مسرت کیا آپ نے جو ایک قطعہ کے معنی پوچھے ہیں، پہلے یہ سُن لیجیے کہ تصوف کے جاننے والے دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جنھوں نے اس علم کی کتابیں دیکھی ہیں۔ صوفیوں کی صحبت میں رہے ہیں، اس کے مصطلحات اور محاورات اور نکات اور دقائق سے ظاہری واقفیت رکھتے ہیں لیکن ان کا باطن اس کی کیفیت سے بکیف نہیں ہوتا یہ اگر کچھ بیان کریں تو بقدر اپنی معلومات کے بیان کر سکتے ہیں گو وہ چنداں بے ٹھور ٹھکانے نہ ہو مگر غلطی سے پاک بھی نہ ہوگا اور عالمِ بے عمل کے وعظ کی طرح ان کے بیان میں اثر اور کیفیت نہ ہوگی دوسرے وہ ہیں جن کے باطن کو اس سے تعلق ہے اس مسلک کے سالک اور اس منزل کے واصل ہیں ان کا کیا کہنا، وہ جو لفظ منھ سے نکالیں گے گوہرِ بحرِ تحقیق ہوگا جو حرف زبان پر لائیں گے ایک دفترِ معارف اور تدقیق ہوگا ان کے صرف بیان میں وہ اثر ہوگا کہ سننے والے مدہوش ہو جائیں، ہر چند علم ظاہری نہ رکھتے ہوں ان کا حال مولانائے معنوی کے اس قال کا مصداق ہوگا ؎

گر کنی خدمت نخوانی یک کتیب | علم ہائے نادرہ یابی ز جیب

فرقۂ اول کا کہنا نرا قال ہے اور دوسرے فرقہ کا سر بسر حال، وہ پرائی کہانی کہتے ہیں یہ اپنی سرگذشت بیان کرتے ہیں اہلِ مذاق اس کو سمجھتے ہیں کہ دونو میں کتنا فرق ہے ایک تیسرا گروہ اور ہے ان دونوں سے علیحدہ، وہ وہ ہیں جن کو نہ اس علم سے ظاہری تعلق ہے نہ باطنی، اس کی بعض باتیں کہیں سن لی ہیں یا کہیں کوئی مضمون شعر میں دیکھ لیا ہے۔ مقلدانہ کبھی کچھ کہہ اٹھے یا شعر میں باندھ بیٹھے نہ ان کا بیان ٹھیک ہوگا نہ کلام باقاعدہ اس قطعہ میں جس کو آپ پوچھتے ہیں ؎

سرمایۂ خم یہ چاہیے ہنگام بیخودی | رو سوئے قبلہ وقت مناجات چاہیے

یعنی بحسب گردشِ پیمانۂ صفات | عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

عجیب خلط مبحث ہے۔ پہلے شعر کا تو یہ مطلب ہے کہ سلوک میں جب جیسی واردات طاری ہو تو ویسا برتاؤ برتنے کیفیت سُکر میں ہو تو سجدۂ بیخودی میں سر پائے خم پر رکھ دے اور حالتِ صحو میں ہو تو مناجات کرنے کو رُو بہ سوئے قبلہ ہو بیٹھے یہ متعلق لبیا کا ہے۔ اور دوسرے شعر کے یہ معنی ہیں کہ تغیر صفات میں بھی ناظر جلوۂ ذات رہے تشبیہہ جو نقاب اور حجاب شاہد تنزیہ ہے اُسے نظارۂ ذات سے مانع نہ ہو ہر صورت میں وہی حسن ہر ذرہ میں وہی چمک دیکھے زبانِ حال سے یہ پکارے ؎

بہر رنگے کہ خواہی جامہ در پوش　　　که من آں جلوۂ قدمی شناسم

اور یہ متعلق بہ عارف ہے پہلے شعر کو دوسرے سے اور دوسرے کو پہلے سے کچھ تعلق نہیں اور تقریر کے مساعدنہ ہونے سے مطالب کا خبط ہو جانا مزید برآں دوسرے شعر کے پہلے مصرع کی بندش نے اور بھی معنی کو ژولیدہ کر دیا ہے اُسے جو یوں کہا ہے۔ یعنی بحسب گردش پیمانۂ صفات۔ یوں کہنا تھا "پیمانۂ صفات کو گردش اگرچہ ہو" دونوں شعروں کو باہم ربط تو اس سے بھی نہ ہوتا مگر دوسرے شعر کے معنی صاف ہو جاتے ہیں عقلمندانہ اور لاعلمانہ کلام اس قابل نہیں ہوتے کہ کوئی اس کی شرح میں فکر کرے غور و خوض کے لائق محققین کا کلام ہوتا ہے یہ کچھ ضرور نہیں کہ جو شاعر ہو وہ صوفی بھی ہو۔

محسن الدولہ محسن الملک نواب مہدی علی خان بہادر منیر نواز جنگ

مخدوم، دو چار ہی دن ہوئے کہ میں نے کچھ اپنے تردوات کے بیان میں ایک خط آپ کو لکھا تھا کل برخوردار خواجہ محمد جان کی تحریر سے معلوم ہوا کہ آپ پر بھی ان دنوں اپنے والد ماجد کے انتقال کا سخت حادثہ گذرا تعجب ہے کہ ممتاز علی خاں صاحب نے مجھے نہ لکھا مجھے بھی اس واقعہ کا نہایت رنج ہوا آپ کو جس قدر ہو

کم ہے اس میں شک نہیں کہ والدین کا سایہ ظلِ ہما سے بڑھ کر ہے مگر جب دنیا خود ہی سایہ کی طرح گذران ہو تو اس کی کس کس بات کا رنج کیا جائے ان کے خوش قسمت ہونے میں کچھ شک نہیں جتنے دنوں جیے عزت و آبرو عیش و آرام میں بسر کی مرے تو آپ سا یادگار چھوڑا کہ جو فخرِ خاندان بلکہ فخرِ ہندوستان ہے خدا ان کو مغفرت کرے اور آپ کو صبر و استقامت عطا فرمائے، اور آپ سے اُن کے نام کو روشن رکھے۔

مولوی محمد حامد

وے کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
زعشق تا بصبوری ہزار فرسنگ است

اس وقت آپ کے اشتیاق نامے نے مجھے سخت متحیر کیا اللہ اکبر یہ اشتیاق کہ ایک عرصہ سے اُس کا ہونا اظہار کیا جاتا ہے اور یہ گریز کہ ایک شہر میں رہ کر ملنا تو درکنار یہ نہیں چاہتے کہ آپ کا حال مجھ پر ظاہر ہو خدا کیجیے یہ بھی کوئی بات ہے آیئے اور ملیے ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپ کا اشتیاق سچا نہیں ہے۔ ذوق کے اس شعر کے معنی جو آپ پوچھتے ہیں ؎

ہیں آئینہ میں صورت تصویر آئینہ
آئینہ رُو کے سامنے حیرانیوں میں ہم

یہاں صورت کے معنی لغوی یعنی نقش اور پیکر یا مجازی یعنی چہرہ اور عکس مقصود نہیں ہے بلکہ اس کے معنی اصطلاحی سے مراد ہے یعنی طرح اور کیفیت اور حالت اور وضع اور مثل وغیرہ، صورت کو ان معنوں میں اساتذۂ عجم نے بھی مستعمل کیا ہے چنانچہ حسرتی لکھتا ہے ؎

من چو دیدم صورتت رفتم زدست
دیگراں را تا چہ صورت داد دست

اے تا چہ حالت قبول ؎

چو دید ابروانِ ترا گفت مانی
کشیدن کمانِ تو صورت ندارد

یعنی امکان ندارد قدسی ؎

فضا ز پایۂ قدر تو صورتے برداشت — زمانہ نام نہاد و شش سپہر کیوانی

یعنی طرح برداشت اور اُردو میں اصطلاحی معنی میں یہ لفظ بہت کثرت سے آیا ہے مثلاً کسی صورت سے یہاں لے آؤ، کوئی صورت ملنے کی نہ تھی، آسمان کی صورت گردش میں ہے، مُردہ کی صورت پڑا ہوا تھا علیٰ ہذا القیاس۔ اس شعر میں صورت بمعنی مثل ہے اور لفظ میں آئینہ سے متعلق نہیں ہے یعنی یہ غرض نہیں ہے کہ آئینہ میں ہیں بلکہ آخر شعر میں جو لفظ ہم ہے اس سے متعلق ہے یعنی ہم ہیں اور تصویر آئینہ سے مقصود وہ تصویر نہیں ہے جو آئینہ کے پیچھے کے تختہ یا ٹین پر بنی ہوتی ہے جیسا کہ آپ سے بھینے والے صاحب کا قول ہے اس کو تو تصویر پشت آئینہ کہتے ہیں۔ اور نہ اس سے مراد ہے جو کاغذ وغیرہ پر کھینچ کر آئینہ کے نیچے رکھ دیتے ہیں جیسا کہ آپ سمجھے ہیں اُس تصویر کو تصویر آئینہ نہیں کہتے بلکہ اس آئینہ کو جو تصویر کے اوپر ہو آئینہ تصویر نما یا آئینہ تمثالی دار کہتے ہیں۔ تصویر آئینہ وہی تصویر ہے جو سطح آئینہ پر کھنچی ہوتی ہے۔ مطلب شعر کا یہ ہے کہ جس طرح تصویر تصویر آئینہ آئینہ کے اندر متحیر ہوتی ہے جو اس کے سکوت سے ثابت ہے اسی طرح اس آئینہ رو کے سامنے ہم حیران ہیں یعنی حیرت میں ہیں اور آئینہ کے ساتھ صورت اور تصویر اور رُو اور حیرانی ان الفاظ مناسب کا لانا شاعر کا حُسن بیان ہے۔ اور اگر بمذاقِ تصوف کے موافق اس کے معنی کیجئے تو شاعر نے مقام قرب کو بیان کیا ہے اور وہ مقام مستلزم حیرت ہے اور معشوق کو آئینہ رُو کہتے ہیں ایک باریک نکتہ یہ ہے کہ جب کوئی آئینہ کے سامنے ہو تو اسے اس میں اپنی ہی صورت نظر آتی ہے، عاشق کو جب مرتبہ قرب کا حاصل ہوتا ہے تو دُوئی کا پردہ اُٹھ جاتا ہے اور وہ کیفیت حاصل ہوتی ہے جس کو حضرت مرزا بیدل نے فرمایا ہے ؎

شب کہ آئینہ آں آئینہ رو گرم دیدم — جلوۂ کرد کہ من ہم ہمہ او گردیدم

اور حیرت چھا جاتی ہے اور یوں کہیئے "من تو شدم یا تو من شدی" مضمون واحد ہے،
ہاں صاحب آپنے یہ القاب ہادی مراحل خدا شناسی جامع علوم ظاہری و باطنی مجھے
کیا لکھا، مجھے اس القاب سے کیا مناسبت، میری صورت میری وضع میری معاشرت
میری حالت سب اس کے خلاف، خدا شناسی اسی کا نام ہے جو میرا حال ہے تو بقول
حضرت مولوی معنوی -

گر ولی این است لعنت بر ولی

آئندہ ایسے القاب سے معاف کیا جاؤں اگر رند لا اوبالی گرفتار ہوا و ہوس حریص دنیا
وغیرہ لکھیئے تو مناسب حال ہے -

حکیم محمد شفیع صفی پوری

اجی حضرت عید ملنے آیا ہوں اٹھیئے اور ملیئے ؎

سخت میخواہم کہ در آغوش تنگ آرم ترا | ہر قدر بفشردۂ دل را بیفشارم ترا

آپ فرمائیں گے کہ عید پیچھے ترکیبی یہ بات نہیں ہے عید کی نماز یعنی رمضان شریف کے
بخیر سدھارنے کا صلوٰۃ الحمد پڑھ کے جو پڑا تو ضعف صوم سے کئی دن بے ہوش پڑا
رہا پھر جو ہوش آیا تو اسی وقت ادھر کو چلا بہت جلدی کی دوڑتا ہوا آیا ہوں جو آج
پہنچا ورنہ اپنا تو ناتوانی سے بقول بادش بخیر بیخبر یہ حال ہے ؎

در اول بہار ار دم گر بسوئے باغ | از ضعف تا رسم بدر آں خزاں رسد

خیر یہ باتیں تو جانے دیجیئے سویاں منگوائیے یا اسے بھی افطاری کی طرح ٹلا دیجئے گا معلوم
ہوا آپ کچھ بھی نہ منگوائیں گے آپ کو ٹالنا خوب آتا ہے، لائیے عطر و پان ہی عنایت
کیجیے میں اب رخصت ہوتا ہوں آپ سے تو یہ بھی امید نہیں ہے کہ بازدید کو تشریف
لائیے گا آپ کو راجاؤں سے کہاں فرصت ملتی ہے کہ غریبوں کی طرف توجہ فرمائیے گا -

محب

خدا کے فضل سے یوسف لقا تو ہو صاحب　　　اب اور چاہیئے کیا ہو پیمبری ہو جائے

خدا کا شکر کرو کہ اس نے تمھیں محبوب صورت مرغوب سیرت حسن شمائل پسندیدہ خصائل فہیم رسا ذہن و ذکا عقل سلیم طبیعت مستقیم علم مفید بخت سعید تقریر کی فصاحت تحریر کی بلاغت اخلاق تام قبولیت عام صولت ثروت قدرت حکومت نیک نامی کا شہرہ شاد کامی کا بہرہ عزت کی دولت، دولت کی عزت سب کچھ دیا ہے۔ سویدا کی صورت جگہ ہر ایک دل میں ہے، نور کی طرح مقام آنکھوں کے تل میں ہے، جیسے دیکھو دامن کی وضع پاؤں پر سر جھکائے ہوئے جس پر نظر کرو رکاب کی مثال قدم آنکھوں سے لگائے ہوئے خواص کو یہ تمنا کہ طرہ کے مانند سر پہ چڑھائے عوام کی یہ خواہش کہ خاک راہگذار کی شکل سواری کے نیچے پس جائے عطر کے مشابہ جس بزم میں آئے مہک اٹھے آفتاب کے مثال جس طرف رخ کیا چمک اٹھے جس مکان میں تم نہیں وہ چمن بے لالہ وگل ہے جو محفل تم سے خالی ہو وہ انجمن بے شمع و گل ہے اور اسی طرح ذکر تمہارا زبانوں پر جاری خون کے ہمرنگ محبت تمہاری رگ جان میں ساری کانوں کو تمھاری آواز کی وہ آرزو جو قلقل مینا کی میخواروں کو یا اذان صبح کی شب بیداروں کو آنکھوں کو تمہارے دیدار کی وہ جستجو جو لقاء خوباں کی عاشق مزاجوں کو یا عید کے چاند کی روزہ داروں کو رعب کی یہ حالت کہ ایک گردش چشم میں لوگوں کے دل دانۂ اشک کی طرح پس جاتے ہیں۔ تالیف کی یہ کیفیت کہ شرح محامد میں خلائق کے قلم گھس جاتے ہیں پھر اب اور کیا چاہیئے ہو کونسی بات نہیں ہے مجھے یہ اندیشہ ہے کہ تمہاری کوشش تحصیل حاصل میں ناسپاسی کی حد کو نہ پہنچ جائے انسان ہوس کو جتنا بڑھائے بڑھتی ہے شاہنشاہی ہونے کے بعد بھی یہ بس نہیں کرتی ہے میری یہ دعا ہے کہ جہاں خدا نے تمہیں سب کچھ دیا ہے وہاں

وہاں قناعت کی دولت بھی عطا کرے۔

اے قناعت تو نگرش گرداں　　　　　که ورائے تو ہیچ دولت نیست

مولوی امیر الدین احمد الہ آبادی آنریری مجسٹریٹ

مکرمی، میرا فغاں جو اپنی نارسائی سے میرے کان تک بھی نہ پہنچتا تھا آپ کی عنایت سے تمام زمانے کے گوش زد ہوا میرا خوننابہ جگر جس کو نارسائی سے میرے دامن کے سوا کسی نے نہ دیکھا تھا آپ کی توجہ سے ایک عالم کا روشناس بنا میرا دلِ غم دوست کبھی فغاں کرنے سے باز نہیں آتا اور میرے ناسور جگر سے ہمیشہ خوننابہ ٹپکا کرتا ہے میں چاہتا ہوں کہ اب بھی جو فغاں لب سے نکلے آپ کے کان تک پہنچے۔ اور جو خونِ جگر سے آپ کی نظر سے گزرے یہ خواہش بھی میرے دل میں آپ کی قدردانی کی نظر سے پیدا ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ جو دلجوئی کرے اسی سے دردِ دل کہنے کو جی چاہتا ہے اور جو آستین شفقت سے آنسو پونچھے اسی کے آگے زیادہ رونا آتا ہے، ورنہ میں نے کبھی ایسی تمناؤں کو دل میں آنے نہیں دیا ہے اور اس سودا سے ہمیشہ میرا دماغ خالی رہا ہے۔ اس وقت تک جو کچھ اردو فارسی نظم و نثر جمع ہوئے ان کو ایک مجلد میں لکھوا کر آپ کی خدمت میں نذر کرتا ہوں، آئندہ بھی جو کچھ اس میں درج کرنے کے قابل ہوگا بھیجتا رہوں گا۔

مولوی محمد حامد

میں اس خط کے عنوان کو القاب سے خالی رکھتا ہوں اس لئے کہ القاب مکتوب الیہ کی شان کے مطابق لکھا جاتا ہے اور جب اُن سے محض لاعلمی ہو تو کیا لکھا جائے اور آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ اپنی شان کے لائق لکھ لیں۔ اس محبت غائبانہ کا کیا شکر ادا کروں کہ آپ کو میری خیریت کی طرف تعلق خاطر ہے اور آپ نے اس کو

مجھ سے دریافت کیا، الحمد اللہ ہر حال میں خوش حال ہوں اور گوشۂ عافیت میں زندگی کی میعاد پوری کر رہا ہوں، قصہ کہانیوں میں سُنا کرتا تھا کہ اس قسم کے دوست بھی ہوتے ہیں کہ محبت رکھتے ہیں اور نظر نہیں آتے تو استعجاب ہوتا تھا جب سے یہ معاملہ پیش آیا کہ آپ دل سے تو مجھ سے محبت رکھتے ہیں اور آنکھوں سے میری چھپے رہتے ہیں، تب سے وہ تعجب جاتا رہا، اب یہ دُعا ہے کہ خالق جن وانس آپ کے دل میں میری محبت کو اتنی بڑھا دے کہ وہ ایک دن کھینچ کر آپ کو میری آنکھوں کے سامنے لا دے۔

خواجہ غلام نبی

برادر عزیز از جان جنت نصیب مغل صاحب مرحوم کا ایسا حادثہ ہے کہ اگر کہوں قیامت آ گئی یا آسمان ٹوٹ پڑا یا زمین پھٹ گئی یا دنیا اجڑ گئی تو بھی کم ہے، کوئی لفظ ایسا نہیں ملتا جس سے اس کی تعبیر کروں اور کہوں کہ کیا ہوا، ایسی مصیبت ہیں کہ اگر پہاڑ پر پڑے تو وہ بھی پاش پاش ہو جائے، کس دل اور زبان سے تمہیں کہوں کہ صبر کرو۔ صبر کی بھی ایک غایت ہوتی ہے یہ تو اس سے کہیں بڑھا ہوا ہے یہ وہ واقعہ ہے کہ صبر خود بے صبر ہے نہ زبان کچھ کہہ سکتی ہے نہ قلم کچھ لکھ سکتا ہے دل فولاد کا، کلیجہ پتھر کا کر لوں تو بھی کچھ لکھا نہ جائے پھر کیا لکھوں بس یہ کہتا ہوں کہ جس خدا نے یہ مصیبت ڈالی ہے وہی صبر بھی دے۔

مُحب

از نالۂ دل ما تاکجے رسیدہ رفتن ۔۔۔ زیں درد مند حرفے باید شنیدہ رفتن

میں نے سنا کہ آپ یہاں سے تشریف لے جانے والے ہیں اور صبر میرے دل سے طاقت میرے جسم سے روشنی میری آنکھوں سے فرحت میری طبیعت سے سکون میرے

حوصلہ سے رخصت ہو کر آپ کی ہمراہی کا ارادہ رکھتے ہیں ایک تو آپ کا سدھارنا دوسرے اپنے رفقائے قدیم کا جدا ہونا جو قیامت میرے سر پہ لائے گا وہ ظاہر ہے مگر کیا کیجئے نہ آپ کو روکنے کی قدرت ہے اور نہ ان سبھوں کو منع کرنے کی طاقت، یوں تو بسر نہ ہوگی اور اجل کے نازِ معشوقانہ الگ ہی جان لینے والے ہیں جب تک اس کا جی نہ چاہے گا وہ آئے گی نہیں، اس لئے میں نے بھی تنہائی اور بے بسی اور بیکسی اور درد اور گریہ بیقراری کو بلانے کا ارادہ کر لیا ہے، یہ سب ایسے سراپا اخلاق ہیں کہ جھوٹوں یاد کیجئے تو بچوں دوڑے چلے آتے ہیں اور میرے ساتھ تو بالخصوص انہیں جیسی محبت ہے وہ کا ہے کو کسو کو کسی سے ہوتی ہے انہیں سے جی بہلاؤں گا اور انہیں کے ساتھ بسر کروں گا آپ سے اتنی استدعا ہے کہ مجھ سے مل کے دو باتیں میری سن کے جائیے گا۔

منشی ولایت علی خاں

مخدوم - آپ کی عیادت فرمانے نے مجھے ممنون ہی نہیں کیا بلکہ اتنا مسرور ہوں، میں اچھا ہو گیا اب بفضلہ بالکل تندرست ہوں یہاں تک کہ پندرھویں رمضان شریف سے روزے اور تراویح بھی شروع کر دی ہے آپ کی ان غائبانہ عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے کا قصد تو جب کرتا کہ ممکن ہوتا محالی ہے اس لئے اس کی مجال نہیں۔

منشی ولایت علی خاں

مخدوم - حکیم صاحب کی تحریر سے مجھے آپ پر اُس صدمہ کا پہنچنا معلوم ہوا جس کو سن کے میرا دل لرز گیا انسان اگر ایک پھول کا درخت لگاتا ہے تو اس کے پھول کا زمین پر گرنا ناگوار گذرتا ہی جب نورِ بصر اشک کے قطرہ کی طرح دامنِ صحرا پہ گرے لختِ جگر

امید کے مانند خاک میں ملے ہیں چاند سے دنیا آنکھوں میں روشن ہو وہ چھپ جائے جس نخلِ مراد سے گھر گلشن ہو وہ صرصرِ خزاں سے خشک نظر آئے جس کا نام سو دعاؤں کے ساتھ لیتے ہوں اس کے نام کے ساتھ ہزاروں نالۂ و فغاں کا ہجوم ہو جس کی درازیٔ عمر کی امید پر باوجود زندگی سے نفرت ہونے کے جیتے ہوں اس کے فراق میں بن آئے مر جانے کی دھوم ہو تو پھر اگر سینہ گریبان سے پہلے چاک ہو دل و جگر کا قصہ بغیر دشنہ اور خنجر کے پاک ہو حیرت سے اشکِ خون کے مثال سوکھ جائے سکتہ سے آہ راہ بھول کے لب تک نہ آئے پھانسی کی طرح گریبان گلوگیر ہو دامن کی وہ دھجیاں اوڑیں جو ایک ایک ان میں سے پاؤں کے لئے زنجیر ہو اندھیری رات میں روشنی ہو تو اپنی آہ سوزاں سے روز سیاہ میں نور ہو تو اپنے داغ سینۂ بریاں سے خشک لب تر ہوں تو اپنے آنکھوں کے پانی سے گوش آشنا ہوں تو اپنے ہی غم کی کہانی سے وصالِ یار سے زیادہ موت کا انتظار ہو مال و متاعِ دنیا سے صرف کفن درکار ہو تو کچھ تعجب کی بات نہیں آپ اپنے فرزند کے انتقال سے ان حالتوں کے مصداق ہوں اور میں لکھوں کہ صبر کیجیے کیوں کر لکھوں خود غم و درد کا مبتلا ہو کر ایسی بیدردی کروں یہ مجھ سے نہ ہوگا اتنا البتہ کہتا ہوں کہ آپ صوفی مشرب بھی ہیں تصحیح خیال ایسے ہی وقتوں میں کام آتی ہے ہجومِ غم میں حقیقت ہی پر غور کرنے سے طبیعت تسکین پاتی ہے اور دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو اسی میں مصروف رکھے اور اضطراب اور اضطرار سے بچائے۔

مولوی وکیل احمد مددگار صدر عدالت گلبرگہ

مرادِ حرف زدن با تو مشکل افتاد است — کہ من علیلم و پہلوئے من دل افتاد است

مریض کو مرض کا زمانہ بسر کرنا ہی دشوار ہوتا ہے چہ جائیکہ خود بیمار اور دوسرے

بیمار کا تیمار دار ہو جیسا کہ میں اس شعر کا مصداق ہوں مگر سچ یہ ہے کہ کام آپ کا خالی کوئی حکمت سے نہ پایا امراض بنائے تو مسیحا کو بنایا۔ اس ناچاقی مزاج میں کہ ایک مہینہ سے تحریک نزلہ اور شدت صرفہ نے جینا دشوار اور زندگی سے بیزار کر دیا ہے آپ کے الطاف صحیفہ کا نزول آپ کے دیوان اور مثنویوں کا وصول دواخانۂ غیب سے نسخۂ شفا کا عنایت ہونا ہے اس تفاول نیک سے امید ہے کہ صحت جسمانی جلد حاصل اور ان کے مطالعہ سے مرض روحانی بھی زائل میری اُستادی پر تو زمانہ کو فخر کیا ہو تاکہ اس کی قابلیت ہی نہیں رکھتا اس فخر پر البتہ مجھے ناز ہے کہ اس بانگ دہل نے مجھے آپ کی مخاطبت اور نعمائے غیر مترقبہ کی عنایت کے قابل کیا اس کا شکریہ مجھ سے صحت میں بھی ادا نہ ہوتا اس بیماری میں کب ادا ہو سکتا ہے مجبورانہ سکوت اختیار اور یہ گوش گزار کرتا ہوں۔

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست۔

محب

تلافی ہمہ بیرحمی وجفائے شما ــــ بہ یک نگاہ اداشد زہے ادائے شما

محبت نامہ کے پہنچنے نے ساری شکایتوں کو دل سے دھو ڈالا کیوں کر ایسا نہ ہوتا میں طفیلی سلام کا مشتاق تھا آپ نے براہ راست مجھی کو خط لکھا، جو ایک پھول ڈھونڈھتا ہو وہ چمن میں پہنچے جس کی آنکھیں پیرہن کے انتظار میں سفید ہوئی ہوں وہ یوسفؑ کو دیکھے، ذرہ کے طالب کو خورشید جلوہ دکھلائے۔ قطرہ کے آرزومند کے سامنے دریا لہرائے بلور کے تلاشی کو الماس ملے روپے کے محتاج کے واسطے خزانے کا دروازہ کھلے طبیب کو بلائیں اور مسیحا آئے دوا منگائیں اور شفا مل جائے صدف کا متمنی صاحب دُرِ شاہوار ہو بوریئے کا حاجتمند مالکِ تختِ زرنگار ہو جو روزنِ دیوار سے دیکھ لینے کو غنیمت سمجھے اس کے سامنے معشوق بے حجاب ہو جو نکہت زلف کے اشتیاق

ہیں بادِ صبا کا منتظر رہے اُس کے ہاتھ میں کاکلِ پر پیچ و تاب ہو جو بندِ قبا تک ہاتھوں کی رسائی کو طالع کی رسائی سمجھتا ہو وہ بندِ قبا کھولے جو دُعا سے زیادہ گالی کا اشتیاق رکھتا ہو محبوب اس سے مہربان ہو کے بولے جو دروازہ تک پہنچنا معراج جانتا ہو وہ محفلِ دلدار میں بلایا جائے جو دور کھڑے رہنے کو بخت کی بلندی تصور کرتا ہو وہ پہلو میں بیٹھایا جائے تو اُسے شادیِ مرگ ہونا ضرور ہے۔ اوہ تو کہئے کہ کبھی ناکامی بھی کامیابی کی ذریعہ ہوتی ہے۔ کبھی محرومی بھی مطلب تک پہنچاتی ہے سخت جانی جو اس درجہ تک پہنچی تھی کہ اس نے غمِ فراق سے مرنے نہ دیا تھا اس نے اس خوشی میں شادی کی موت سے بچا لیا ایک عمر کے بعد خدا نے یہ دن دکھائے کہ جس زبان پر ہمیشہ قسمت کی شکایت کی تکرار تھی وہ آج اس کی شکر گزار ہے الٰہی آیندہ بھی مجھے یہ خوش وقتی نصیب رہے کہ یار کے استغنا سے دُور ہوں اس کا التفات مجھ سے قریب رہے۔

حافظ محمد زکریا خاں زکی

مخدوم۔ آج تیسرا چوتھا دن ہے کہ صبح کو جو خواب سے بیدار ہوا تو ایک ایسی خوشی دل پر چھائی کہ آنکھ کیا کھلی گویا درِ نشاط کھل گیا دیکھتا ہوں تو در و دیوار پر کچھ اور ہی چمک دمک ہے زمین و آسمان پر عجب طرح کے نور کی جھلک ہے صبح کے دلبر صبیح صورت کی صورت پر کچھ اور ہی جلوہ ہے شاید آفتاب کا اور دنوں سے زیادہ نور افشاں چہرہ ہے مجھے حیرت ہوئی اور آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگا کہ الٰہی ہے کیا سحرِ عید ہے یا صبحِ نو بہار ہے روزِ نوروز ہے جو ایسی مسرت نمودار ہے اس کے ساتھ ہی یہ خیال ہوا کہ یہ سب ہی مگر تیرے غمزدہ دل کو خوشی سے کیا سروکار کبھی سنا ہے کہ ماتم سرا میں ہنسی آئے اور روتا ہوا باتوں سے بہل جائے اس کا غم تو خوشی میں اور بڑھتا ہے عید اس کے لئے محرم ہے یہاں اس کی

آنکھوں میں خزاں نوروز ہر روز سے زیادہ غم اندوز ہے ہنساؤ تو اسے رونا آتا ہے بہلاؤ تو اور بھی مچل جاتا ہے اس کے حق میں صبح ایک اژدہائے خونخوار ہے جو مشرق کی غار سے نکل کر آفتاب کا کفچہ پھیلائے ہوئے چلا آتا ہے۔ شام ایک دیو سیہ کار ہے جو مغرب کے کوہ قاف سے سر اٹھائے ہاتھ پھیلائے آکر دبائے ڈالتا ہے اسی حیرت میں تھا کہ ڈاک کے ہرکارہ نے آپ کا دیوان لاکر دیا، پہلے جو چھپنے کا ذکر آپ نے کبھی لکھا نہ تھا دفعتاً اس کا پہنچنا نعمتِ غیر مترقبہ ہوا اب سمجھا کہ یہ تمام جوشِ نشاط اور ہجوم انبساط اُس کی آمد کا تھا کیوں کر نہ ہوتا ایک دولت کسی کے ہاتھ آئے تو جامے میں نہیں سماتا مجھے تو اس ایک چیز کے ملنے سے دو دولت ملی ایک سخن کی دولت دوسرے آپ سے ہمکلامی کی پھر مجھے جتنی فرحت ہو کم ہے۔ آپ کے دیوان کی تعریف آپ کو لکھنی، یوسف کو آئینہ دکھانا ہے اور خورشید کو نور کا قصہ سنانا ہے لیکن اتنا لکھے بغیر تو رہا نہیں جاتا کہ سلاست زبانِ حسن بیان فراوانیٔ فصاحت بے پایانی بلاغت دل نشستی معنی رنگینی الفاظ جدت مضامین نازکی خیال والائی تلاش انگیز ادا بلندی فکر رسائی ذہن، استحوال بندی ترکیب بدائع صنائع کیا ہے جو اس میں نہیں ہے خدا آپ کو درازی عمر میں رشک افزائے خضر و الیاس کرے کہ ایسے دیوان اور بہت سے تصنیف ہوں میں تو کہاں ہوں گا میرے جلنے کے بعد آنے والے سرگرم تعریف ہوں۔

منشی فدا علی عیش

اللہ اکبر۔ ایسے زمانے میں کہ ایک عمر کی ملاقات پر دو دل حروف لفظ دو دل کی طرح ملتے نہیں ایک دوسرے سے جدا ہی رہتے ہیں ایسے لوگ بھی ہیں جن کے دل کو محبت سے وہ چسپیدگی ہوتی ہے جو لفظ محبت کے حروف کو باہم ان

ہیں بھی اعلیٰ درجہ کے وہ حضرات ہیں جو دل میں الفت کو راہ دینے کے لئے آنکھوں کے واسطے کے پابند نہیں ہوتے، جیسے آپ ہیں پھر آپ نوادر روزگار اور مغتنمات زمانہ سے کیوں نہ ہوں، یہ آپ کی قدر دانی ہے کہ آپ نے مجھے الطاف غائبانہ کا سزاوار اور میرے ہذیان کو قابل التفات سمجھا، ورنہ میں اس لائق ہوں نہ میرا کلام میری ہستی کے لئے باعثِ عار وننگ ہوں اور وہ آئینہ سخن کے واسطے زنگ، لکھنؤ میں آپ کے صاحبزادے کی ملاقات سے بہت مسرور ہوا تھا الولد سر لابیہ جب آپ جامع کمالات ہوں تو ان کا بھی محمود الصفات ہونا ضرور ہے نسخۂ "سیر عشق" کی سیر سے مجھے وہ لطف حاصل ہوا جو آپ کو اپنی سیر سے نہ ہوا ہوگا اب خدا سے یہ التجا ہے کہ آپ کی ملاقات سے جلدی حصول سرور ہو اور آپ سے یہ تمنا ہے کہ جب تک اس کا وقت آئے المکتوب نصف الملاقات پر عمل آپ کا دستور ہو۔

منشی علی عمر صاحب سیکرٹری کتب خانہ اسلامیہ بمبئی

قدردان میرے ۔ الطاف نامہ آیا ایزدِ فریاد رس کا شکر ہے کہ میرا فغاں کس مشنو آپ کے کان تک پہنچا مجھے تو یہ ڈر تھا کہ نصیبِ دشمناں دردِ سر بڑھائے گا یہ کسے امید تھی کہ ایسا ناموزوں فغاں پسند آئے گا سچ تو یہ ہے کہ محض آپ کی اور وہاں کے حضرات کی قدردانی ہے ورنہ وہ فغاں جو گوشِ شنوا کی تلاش میں ہمیشہ زمین سے آسمان تک جائے بلکہ عرش کو جنبش میں لائے اور کوئی اُسے کان لگا کر نہ سُنے کب قبول کے قابل ہو اور وہ خونابہ جو دیدۂ بینا کی تمنا میں دن رات جگر سے نکل کر دامنِ صحرا تک پہنچے اس طرح کہ اس کی روانی پر دریا کو رشک آئے اور کوئی اسے آنکھ اٹھا کے نہ دیکھے کس لئے کوئی اس کا مائل ہو انکا قدر افزائی کی نعمت کی ناسپاسی تھی اس وجہ سے آج اس کو یعنی خونابہ جگر کو بھیجتا ہوں خدا کرے

یہ بھی اپنا رنگ جمائے آپ حضرات کی خاطر دشوار پسند کے پسند آئے۔

حکیم قیام الدین بخت جونپوری

دولت آں است کہ بیخون دل آید بکنار ورنہ باسعیِ عمل باغ جہاں ایں ہمہ نیست

کسی معرف کا احسان اٹھایا، کسی متوسط کا ممنون ہوا یہ کچھ نہ سہی آنکھوں ہی کو میانجی کرنا پڑا اب دو دلوں میں ارتباط کرنا پڑا تو کیا، لطف تو جب ہے کہ یہ سب بالائے طاق رہیں آنکھیں بھی کچھ نہ دیکھیں بیگانہ وار رہیں، کان نہ سنیں زبان کو موقع بولنے کا نہ ملے اور دو دل باہم آشنا ہو جائیں خدا کا شکر ہے کہ مجھے یہ دولت نصیب ہوئی آپ سے بظاہر ملے نہیں ایک دوسرے سے دور رہے اور محبت دلوں سے قریب ہوئی میرا نظم و نثر اردو اور فارسی اس قابل تو تھا نہیں کہ میں اُسے چھپواتا اپنے عیوب کو ظاہر کرکے کاغذ کا منھ کالا کرنا، ان کی حقیقت تو ان کے ناموں ہی سے ظاہر ہوتی ہے ایک فغانِ بخبر دوسرا خونابۂ جگر۔ رازدارانِ محبت خوب جانتے ہیں کہ فغانِ نوحہ گر کو کون کان لگا کر سنتا ہے، خونابۂ جگر کو کون آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہے، وہ ہمیشہ ہذیانِ مجنوں کی طرح بے اثر ہوتا ہے اور یہ خونِ نخچیر کے مانند بار، مگر عیب کے خریدار دوست ہی ہوتے ہیں۔ مولوی امیر الدین احمد صاحب نے جو اپنے سے زیادہ مجھے عزیز رکھتے ہیں دونوں مجموعہ مجھ سے چھین لئے اور چھپوا دیا ابتدا میں کچھ جلدیں ان کی میں نے لے لیں اور دوستوں کو دیں افسوس ہے کہ اب میرے پاس باقی نہیں ہیں ہوتیں تو ضرور ہدیۂ خدمت کرتا آپ سے سخنداں سے دریغ رکھ کے جانِ سخن پہ حیف روا نہ رکھتا آپ مولوی صاحب موصوف سے البتہ طلب کر سکتے ہیں پتہ ان کا یہ ہے شہر الہ آباد محلہ بیجنے پور مکان حضرت حکیم بادشاہ صاحب قدس سرہٗ، اگر خواہی

نخواہی اس کے دیکھنے سے تضیع اوقات منظور ہو تو منگوا لیجیے، سبقت الطاف کا جیسا اس دفعہ سپاس گزار ہوں، آئندہ بھی اس کا امید وار ہوں۔

شمس العلماء، مولوی ذکاء اللہ خان بہادر

مدتے شد کہ رہِ مہر و وفا مسدود است

نہ کسے میرود آنجا نہ کسے می آید

کیوں مخدوم آپ کو کبھی یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ ایک فقیر گوشہ نشین درویش غزلت گزین بےخبر دلِ حزیں نام میرا دعاگوئے قدیم الہ آباد میں رہتا تھا کچھ اس کی تو خبر لیں کہ وہ ہے یا کیا ہوا۔ یا جب وہ اپنی خبر دے تب آپ بھی کچھ پوچھیں، ورنہ کچھ اس سے غرض نہیں کہ کون تھا اور کدھر گیا۔

ایں نہ بود امید واری گر یہ می آید مرا

بہر حال وہ تو آپ کا ویسا ہی فدائی ہے جیسا تھا۔

امروز یقیں شد کہ نداری سرِ اہلی　　　　بیچارہ غلط داشت بمہر تو گمانہا

محب

افسوس۔ اس طلسم دنیا میں کیا خاک کوئی دل لگائے راحت سرائے عدم سے اس شورش کدہ میں آنے کے غم کو کس طرح بھلائے جہاں نہ کسی کی بات کو قیام ہے نہ کسی قسم کا آرام ہے بے ثباتی کی یہ حالت کہ چشم زدن میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے بہار آتے ہی پھولوں کے کان میں چپکے سے کہہ دیتی ہے کیا خوشی سے پھولتے ہو ہم خزاں کے آنے کا پیغام لاتے ہیں، بچہ پیدا ہوتا ہے تو سب ہنستے ہیں، خوش ہوتے ہیں اور وہ اس پر روتا ہے کہ ہم تو مرنے کو یہاں آئے ہیں صبح کو نور کا تڑکا ہے تو شام کو

ظلمت کا دھڑکا ہی شب کو انجم کی انجمن کا اہتمام ہے تو دن کو اس کی ترکی تمام ہے بے آرامی کی یہ کیفیت ہے کہ جس راحت کو دیکھیے اس کے پردہ میں رنج چھپا ہوا ہے غنچہ کے کھلنے کو لوگ شگفتگی جانتے ہیں اور وہ زبانِ حال سے کہتا ہے کہ ہم اس گل کدہ میں اپنا چاکِ جگر دکھاتے ہیں تصویر کو ہر ایک مکان کی آرائش اور زینت خیال کرتا ہے اور وہ خاموشی سے یہ مضمون ادا کر رہی ہے کہ ہم اس عبرت آباد میں اپنے سر کو دیوار سے ٹکراتے ہیں زندگی جسے سرمایۂ آسائش کہتے ہیں درحقیقت نفس شماری ہے عالم سے ہر شخص سکون اور قرار کا طالب ہے اور فصلوں کے تغیر سے ظاہر ہے کہ وہ خود گرفتارِ بیقراری ہے ہنسی کی کثرت میں آنکھوں سے آنسو کا ٹپک پڑنا اس کی دلیل ہے کہ شادی میں غم شامل ہے محاسب عقل بہ سرِ حساب آئے تو ثابت ہے کہ یہاں رنج مسرت سے فاضل ہے بہت سچ کہا ہے ؎

جہاں میں عرصۂ شادی سے سوا دہ چند ہے غم کا
کہ ہے گر عید کا اک دن تو عشرہ ہے محرم کا

کمال افسوس اس کا ہے کہ جو زمانے کے لئے باعثِ فخر و ناز ہوتے ہیں زمانہ انھیں سے دغا کرتا ہے جن سے اسے زیب و زینت ہوتی ہے وہ انھیں کو خاک میں ملاتا ہے دور کیوں جائیے ابھی کل کی بات ہے کہ آپ کے بھائی بزمِ جہاں کے چراغ تھے آج دلِ احباب پر داغ ہیں، کل لوگ ان کے ذکر سے خوش ہوتے تھے آج ان کی یاد میں روتے ہیں ایسے بھائی آنکھوں کے سامنے سے اٹھ جائیں یہ صدمہ آپ کے لئے کچھ کم نہیں مگر صبر کے سوا اور چارۂ الم نہیں خدا انہیں جنت میں جگہ دے آپ کو توفیقِ صبر عطا کرے یہ مصیبت آپ کے لئے مقطعِ مصائب و آلام ہو آئندہ جو پیش آئے وہ مطلعِ انبساط و آرام ہو۔

مُحب

یاس و غم و آرزو جمع یہ سب چیز ہے
بل بے سمائی تری دل بھی عجب چیز ہے

جب حکیم علی الاطلاق نے رنج کو مشکل اور عجز کو مجسم کر کے اس ہیکل کا نام انسان

رکھا جیسا خود فرماتا ہے لقد خلقنا الانسان فی کبد اور پھر اس کو اشرف المخلوقات
کے خطاب سے مخاطب کیا تو اس نے اپنی حکمت بالغہ سے ایک مضغہ صنوبری دل نام اس
حوصلہ کا بنا کے اس کے سینہ میں رکھ دیا جس میں دونوں جہان کی آرزو اور تمنا امید اور
یاس غم اور الم رنج اور محن اندوہ اور ملال سب کی گنجائش بدرجہ کمال ہو اور اس کو اس صنعت
سے بنایا کہ نزاکت میں تو شیشے سے زیادہ سختی برداشت کرنے میں پتھر ہو جانے کو آمادہ
اس کے تو علم میں تھا کہ اس کو جو سب سے اشرف و اعلیٰ ہونے کا مرتبہ دیا گیا ہے تو اسی کو
اعظم مصائب اور بلیات کا مورد بھی ہونا ہوگا اگر اس کو ایسی چیز نہ دی جائے گی تو ان
مصیبتوں کا تحمل کیونکر کرے گا اور بعد اس کے اس کو ولقد کرمنا بنی آدم کا خلعت خاص
عطا کر کے عالم امکان میں بھیجا تو علاوہ اور مصیبتوں کے ایک نہایت سخت مصیبت
مفارقت کی اُس پر نازل کی یعنی جسے جی چاہے اس کی جدائی الحفیظ الامان جن پر پڑتی
ہے وہی اس کی حقیقت کو خوب جانتے ہیں یہ ایسی بلا ہے جس سے بے نشتر چبھائے کلیجہ
خون ہو کر بہہ جاتا ہے بے آگ لگائے سینہ آتش کدہ بن جاتا ہے اسی سے آنکھیں دریائے
اشک کے طوفان میں امید کی کشتی کو ڈبانی ہیں اسی سے آتشیں آہیں خرمن تمنا پر یاس
کی بجلی گراتی ہیں اسی سے جوش حیرت میں انسان مبہوت ہو جاتا ہے کہ اپنے حال پر ہنسی
نہیں آتی اسی سے از خود رفتہ ہو کر آدمی کو ایسی چپکی لگ جاتی ہے کہ اپنی حالت بھی کہی
نہیں جاتی اسی سے نیند اور آنکھ اور سر اور بالیں میں عداوت ہوتی ہے اسی سے
قرار اور طبیعت تسکین اور مزاج میں مغائرت ہوتی ہے اسی سے بن آئے مر جاتے ہیں اگرچہ
موت کا ایک دن مقرر ہے اسی سے قسمت پلٹ جاتی ہے ہر چند وہ بات بدلتی نہیں
جو مقرر ہے اسی کی جادوگری ہے کہ زمین پر پڑے ہوئے خاک اڑاتے ہیں اور دل ڈوبا
جاتا ہے اسی کی نیرنگ سازی ہے کہ آہ شرر افشاں سے سرو چراغاں بنے رہتے ہیں اور
چراغ حیات بجھا جاتا ہے اسی کے کرشمے ہیں کہ ضعف سے خود تو اٹھا نہیں جاتا مگر شور فغاں

قیامت سر پہ اٹھاتے ہیں نقاہت سے تنکا تو ہلایا نہیں جاتا لیکن آہِ رسا سے عرش کی زنجیر ہلاتے ہیں، اسی سے ناز پروردوں کے مصیبت میں بادیہ پیمائی ہوتی ہے اسی سے پاؤں کے آبلوں کو صحرا کے کانٹوں تک رسائی ہوتی ہے اسی سے راحت کی امید پر آنکھیں بند کیجیے تو وہ خواب میں نظر نہیں آتی اسی سے آسائش کی آرزو میں پلک نہ جھپکائیے تو بیداری میں وہ صورت نہیں دکھاتی سخت جانی سے اپنے کو پتھر بنائیے تو یہ اُسے شیشہ بنا کر توڑتی ہے خاکساری سے اپنے کو خاک میں ملائیے تو یہ نقشِ قدم بنا کر پامال کرکے چھوڑتی ہے اسی سے دم سینہ ایسا گھبراتا ہے جیسے قیدی قید خانہ میں گھبرائے اسی سے کلیجہ امنڈ کر اس طرح منھ کو آتا ہے جس طرح جان لبوں پر آئے اسی سے انسان بغیر گلے پر چھری پھیرے مرغ بسمل کی طرح تڑپتا ہے فرق اتنا ہے کہ وہ ٹھنڈا ہو کر ٹھہر جاتا ہے اور یہ مر کر بھی تڑپتا ہی رہتا ہے اسی سے آدمی جرس کے مانند فغاں کیا کرتا ہے تفاوت اس قدر ہے کہ وہ منزل پر پہنچ کر چپ ہو جاتا ہے اور یہ منزل گور میں بھی چلاتا ہی رہتا ہے اسی کے مارا ہوا نے کے مثال نالے کیا کرتا ہے مگر اس کو سب سنتے ہیں اِس کو کوئی سنتا نہیں اسی کا گرایا ہوا دیوارِ کہنہ کی صورت خاک پر گرا رہتا ہے لیکن اُسے لوگ پھر اُٹھاتے ہیں اور یہ کسی کے اٹھائے اٹھتا نہیں اسی کے مبتلا کو زہر کی اتنی ہی تلاش ہوتی ہے جتنی سکندر کو آبِ حیات کی تھی اسی کے گرفتار کو موت کی اتنی ہی جستجو ہوتی ہے جتنی مجنوں کو لیلےٰ کی ملاقات کی تھی اسی کے لاغر بیمار کو تار بستر سے جدا کرنا ملک الموت سے بھی ہو نہیں سکتا اسی کے شب بیدار کو خوابِ مرگ بھی چاہے کہ دم بھر سلائے تو وہ سو نہیں سکتا انسان اتنی مصیبتیں اٹھا کر جو زندگی کا دم بھرتا ہے اپنے کو زندوں میں شمار کرتا ہے تو حضرتِ دل ہی کے بدولت اگر اُسے حوصلہ صبر و شکیبائی کا نہ ہوتا، اس کا ظرف اس سمائی کا نہ ہوتا تو یہ خاک کا پُتلا یہ پانی کا بلبلہ اتنی آفتیں جھیل سکتا۔ ایسی جانبازی کا کھیل کھیل سکتا، میں بھی جو تمہاری مفارقت میں اتنی

جان نہ ہونے پر زندہ کہلاتا ہوں جینے کے غم کو موت کی امید سے تسکین دے کر بہلاتا ہوں تو اتنی ہی کی ہمت ہے ورنہ ماہی آب سے چکور مہتاب سے پروانہ چراغ سے بلبل باغ سے دور رہ کر جیسے توجیئے ہیں تم سے جدا رہ کر ہرگز جی نہیں سکتا میرا تمہاری جدائی میں جینا ایسا محال ہے جیسا بے قضا آئے کسی کا مرنا اتنے دنوں جس طرح گزرے وہ گزرے آخر کہاں تک، ہر امر کی ایک غایت ہر بات کی ایک نہایت ہوتی ہے۔ بس اب مجھے اس عذاب سے چھڑاؤ اس جور وستم سے باز آؤ نہیں تو ایک دن وہ دن آئے گا کہ لوگ تم سے آکر کہیں گے۔

کل گئے تھے تم جسے بیمار ہجراں چھوڑ کر   چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

شیخ رفعت علی

صد بہار آخر شد و ہر گل بفرقے جا گرفت   غنچۂ باغ دل من زیب دستارے نہ شد

الہ آباد کا دربار رہ لیا لکھنؤ کا دربار ختم ہوا۔ کوئی آتا تو کیا یہ بھی نہ معلوم ہوا کہ مولوی شیخ عبدالحق صاحب خیرآبادی نے کس دربار میں شمس العلما کے خطاب کی سند حاصل کی شیخ رفعت علی صاحب نے کہاں کہاں کی سیر دیکھی کس کس سے ملے کسی نے بھی نہ لکھا کہ تم سے ملنے کا وعدہ وفا نہ کرنے کا یہ سبب ہوا۔ وفور اشتیاقِ ملاقات پر تو یہ حال ہے کچھ نہ ہوتا تو کیا ہوتا یہاں قبل دربار کے تو دن گن گن کے کاٹے دربار کے بعد سے تردد میں تڑپ تڑپ کے بسر کر رہے ہیں ؎ من ہیوفا نیم بوفامی خورم قسم   من چوں شما نیم بشما میخورم قسم

غلام علی خاں

رسائی کان تک تیرے ہوئی حاصل نصیبوں سے   نہ کیونکر رشک گمنامی سی میری ہووے شہرت کو

باوجود محرومی ملاقات ظاہری سے آپ کی غائبانہ محبت نے نہ صرف آپ کے وسعت اخلاق ہی کا ممنون کیا بلکہ آپ کی قدر دانی نے حضیض ہیچمیرزی سے اوجِ شہرت پر پہنچا دیا

میں نے کبھی اپنے کو انشا پردازوں میں اور شاعروں میں شمار نہیں کیا اس سبب سے اگر کبھی بے اختیاری دل سے کوئی نالہ بپیرایۂ نثر یا کوئی فغاں سلسلہ نظم میں لب تک آیا اور غمازی خلعہ نے اسے گوشِ صفحہ تک پہنچایا تو وہ ترتیب اور تدوین سے ناکام رہا۔ میرے ایک عنایت فرمانے جو اس شہر کے مشاہیر روساسے ہیں اور مجھ پر مجھ سے زیادہ شفقت فرماتے ہیں ان اوراق پریشاں کو شیرازہ بند جمعیت کر کے زینت اشاعت مزین کرنے کی غرض سے چھپوادیا ہے میرے پاس اس کی جلدیں نہیں ہیں انہیں کے پاس ہیں ان کا نام نامی مولوی امیر الدین احمد صاحب آنریری مجسٹریٹ اور نشان سکونت شہر الہ آباد محلہ یحییٰ پور ہے اُن سے آپ طلب فرمائیں، تو وہ بے تامل بھیجدیں گے، میں نے ان کو لکھ دیا ہی خود اس خدمت کے سر انجام نہ دینے سے نادم اور خجل ہوں۔ والسلام۔

استفسار

قاضی علی احمد بدایونی

مکرمی۔ آپ جو تحریر فرماتے ہیں کہ کسی نے حضرت امیر خسرو کے اس شعر پر ؎

جان زتن بردی و درجانی ہنوز　　دردہا دادی و درمانی ہنوز

یہ اعتراض کیا کہ جب جان ہی تن سے نکل گئی تو معشوق اس میں کیونکر رہا اور آپ نے اس میں یہ تاویل کی کہ جان مجازی کے جانے کے بعد جان حقیقی باقی رہتی ہی اس تفریق اور تقسیم جان کو جو آپ فرماتے ہیں خارج از مبحث رکھ کر پہلے تو یہ دیکھا جائے کہ اعتراض کیسا ہے ایسا ہے کہ بالکل ہی معترض کی ناواقفی پر دلالت کرتا ہی ظاہرا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ جان جسم سے علیحدہ ہوجانے کے بعد معدوم اور فنا ہوجاتی ہے اس وجہ سے اس میں کسی کیفیت کا باقی رہنا محال جانتے ہیں حالانکہ یہ مسئلہ متفق علیہ ہے کچھ حضرات صوفیہ ہی پر موقوف

نہیں شارعین اور متکلمین متصوفین جمہور کو اس پر اتفاق ہے کہ جان تن سے نکلنے کے بعد باقی رہتی ہی اور جب یہ مسئلہ مسلمہ ٹھہرا تو پھر اس میں کسی کیفیت کا باقی رہنا کیوں غیر ممکن خیال کیا جاتا ہی اگر کوئی یہ کہے کہ صراحی سے شربت نکل گیا مگر پانی میں قند کی شیرینی باقی ہی یا شیشہ سے گلاب اونڈل پڑا مگر گلاب میں بو باقی ہی تو مستبعد نہ سمجھا جائے اور یہ کہنا کہ جان تن سے علیحدہ ہوئی اور جان میں تعلق محبوب باقی ہی بعید از قیاس کہا جائے تو حیف کی بات ہے جو لوگ اسرارِ محبت سے واقف نہیں ہیں یہ خیال کرتے ہیں کہ محبت بھی مثل اور امراض کے ایک مرض ہی کہ اس کا قیام اسی وقت تک ہو سکتا ہی جب تک جان تن میں ہو مگر جو رازِ محبت کو جانتے ہیں وہ اس کو مانتے ہیں کہ محبت صادق کا تعلق جان ہی کے ساتھ ہوتا ہی اور گو جان تن سے جدا ہو وہ تعلق ہرگز جان سے جدا نہیں ہوتا حضرت امیر بھی یہی فرماتے ہیں کہ جان کو تم نے جسم سے علیحدہ کیا لیکن تم جان سے علیحدہ نہ ہوئے یعنی تمہاری محبت کا تعلق باقی رہا غنیمت سمجھیے کہ معترض نے یہ اعتراض نہ کیا کہ معشوق اس ڈیل ڈول پر جان کے اندر کیسے سما گیا جو کہتے ہیں درجانی ہنوز ایسے اعتراض اس قابل نہیں ہونے کہ کوئی اُسے سُن کر جواب دینے میں اوقات ضائع کرے یہ آپ کی خاطر تھی کہ اتنی خامہ فرسائی کی اور پھر وہ بھی رمضان شریف میں۔

سید محمد محسن خاں بہادر ذوی القدر

مکرمی۔ حضرت حافظ کے اس شعر میں ؎

ترا آں بہ کہ روئے خود ز مشتاقاں بپوشانی

کہ سودائے جہاں داری غمِ لشکر نمی ارزد

معشوق کو بادشاہ سے اور مشتاقوں کو لشکر سے تشبیہ دی ہی وجہ تشبیہ پہلے میں مرجعیت اور فرماں روائی اور دوسرے میں کثرت اور فرمانبرداری ہی اور حرف رابطہ

دونوں مصرعوں کا کاف علت جو دوسرے مصرع کے شروع میں ہے مگر یہ دونوں باتیں ایسی کھلی ہوئی ہیں کہ قابل استفسار نہیں یا میں اس سوال کا مطلب نہیں سمجھا اگر ایسا ہو تو پھر تفصیل سے لکھیئے اس شعر میں لفظ سودا غلط لکھا گیا ہی صحیح یوں ہے کہ "شادی جہاں داری غم لشکر نمی ارزد" لفظ غم بھی یہی چاہتا ہی کہ سودا کی جگہ شادی ہو اور اس کو دو طرح سے پڑھ سکتے ہیں۔ بیو شانی یعنی تم مشتاقوں کی طرف توجہ نہ کرو شادی جہاں داری اس قابل نہیں ہی کہ اس کے لئے غم لشکر اٹھایا جائے یہ تخویف اس لئے کہ وہ لوگوں کو منھ نہ دکھائے، اور رقیبوں کی کثرت نہ ہوجائے۔ بنو شانی یعنی تم مشتاقوں سے پردہ نہ کرو جہاں داری کے شادی کے مقابلہ میں غم لشکر کوئی چیز اور اس کی کچھ حقیقت نہیں، یہ ترغیب اس واسطے کہ وہ جلوہ گر رہے، اور دیدار نصیب ہوا کرے، اس کا علم خدا کو ہے کہ شاعر کا مطلب کیا تھا۔

تقریظ

انشائے بہار بیخزاں از مولینا غلام امام شہید

مردم دیدہ آج گھر بیٹھے بہشت کی سیر کرتے ہیں۔ اللہ اللہ صفحۂ قرطاس پر کیا جوش بہار معانی ہے! تا رنگاہ میں بے تکلف موتی پروئے جاتے ہیں۔ واہ وا! کلک گہر بار کی کیا درفشانی ہے! سبحان اللہ! یہ کیسی انشا ہی؟ جس کے دیکھنے سے یہ لطف اٹھتا ہے۔ کتاب ہی؟ یا گلزار بیخزاں۔ جس صفحہ کو دیکھیے۔ حاشیۂ فردوس کے روشوں پر حاشیہ لکھتا ہی۔ جدول کے خطوں پر سلسبیل اور کوثر کا جی پانی پانی ہوتا ہی۔ سطریں سنبلستان ہیں۔ الفاظ گلستان ہیں۔ حرف کی کششوں پر سرو اور شمشاد کا یقین ہوتا ہی۔ دائروں سے نرگستان آنکھوں کے تلے پھر جاتا ہے۔ حرفوں کی سیاہی سے

کاغذ کی سفیدی وہ کیفیت دکھاتی ہے۔ گویا درختوں سے چاندنی نے کھیت کیا ہے کاغذ کی سفیدی پر حرفوں کی سیاہی کی وہ بہار نظر آتی ہے جیسے صحن باغ پر بادل چھا رہا ہے وہاں قوت نامیہ سے درخت ہر سال پھولتے پھلتے ہیں۔ یہاں فکر دراکہ سے جب دیکھیے فقرات برجستہ سے معانی تازہ نکلتے ہیں۔ مجموعہ ہے۔ یا گنج شایگان۔ ہر باب میں ایسے ایسے بے بہا جواہر حکمت کے بھرے ہیں کہ جسے دیکھ کے جوہری عقل کی عقل چکراتی ہے۔ ہر فصل میں اتنے نقد کامل عیار دانش کے انبار دھرے ہیں۔ کہ مقدار اس کی صیرفی ذہن میں نہیں آتی۔ یہ وہ جوہر ہے جس کے رکھنے کو حلقہ چشم درجک ہو تو بجا ہے۔ اور یہ وہ نقد ہے جس کے پرکھنے کو سویدائے دل محک ہو۔ تو زیبا ہے شہر علم کے مفلسوں کو صلائے عام ہے۔ کہ اس کی سیر کو آنکھیں کھولیں۔ دامنِ نگاہ میں موتی رولیں۔ دیار دانش کے ناداروں کو اجازت تام ہے۔ کہ اس گنجینہ کے دیکھنے کو آئیں۔ جتنا حوصلہ ہو۔ اٹھائیں۔ خالی ہاتھ نہ جائیں۔ کتاب ایسی کیوں نہ ہو جب مصنف اس کا وہ ہے جس کی فصاحت نے سحبان کے منہ میں قبر کی مٹی سے خاک بھری۔ اور جس کی جادو بیانی نے سحر بابل کی قدر مٹی کی۔ یعنی فاضل بے بدل۔ عالم عدیم المثل منشی اعجاز نگار۔ شاعر سحر گفتار۔ مولینا غلام امام شہید جن کا ثانی فضل کمال میں نہ دیدہ ہے نہ شنیدہ۔ تحریر۔ عربی سے ان کی اعشیٰ اور جریر کی پیٹھ قبر میں نہ لگی تھی۔ نثر فارسی سے ظہوری اور طغرا خواب عدم میں چین سے نہ سوئے تھے۔ شعر نے انوری کو بے نور خاقانی کو لنگڑا کر دیا تھا۔ اب ان کی اُردو سے سودا کی روح کو سودا ہوگا۔ میر اپنا مرنا غنیمت جانے گا۔ ہوس کو پہلے ہی خوب سوجھی۔ جو یہ تخلص اختیار کیا۔ یعنی در پردہ معذرت چاہی۔ کہ میں تو ہوس کرتا ہوں۔ کمال حق اور کسی کا ہے۔ سوز کو بھی کچھ ان کی خبر پہنچ گئی تھی۔ کہ آتش رشک سے جل کر یہ تخلص اپنے حسب حال رکھا۔ ناسخ اب ہوتا تو منصفی سے تخلص اپنا منسوخ مشہور کرتا۔

آتش نہ مرتا۔ تو کیسا کیسا جلتا؟ ان کی اس نثر نے رتبہ نظم کا کھو دیا۔ استادوں کا سفینہ
دریا میں ڈبو دیا۔ سچ تو یوں ہے۔ کہ ان کی حیثیت اور اردو نویسی زمین و آسمان کا
فرق ہے۔ اس پر بھی اگر تفنن طبیعت کے لئے ادھر کچھ میل کرتے۔ تو ایسی لکھتے۔ کہ
ان کی اردو انشا کے سامنے **علامی** اپنی انشا سے خط غلامی لکھتا۔ بہار دانش کی
بہار پر خزاں کا وقت آجاتا۔ سہ نثر ظہوری کو لوگ چھپا ڈالتے۔ طغرا کی تحریر کو خط
باطل کی طرح مٹا ڈالتے۔ پر اس سے مجبور ہوئے کہ فرمائش نثر عاری کی تھی۔ گو انھیں
اس سے عار تھا۔ پر حکم ماننا ناچار تھا۔ لیکن لوٹ جانے کی جا ہے۔ کہ اس سادگی میں سیکڑوں
طرح داری کا مزا ابھرا ہے۔ اپنے نزدیک گو کچھ نہ لکھا ہو۔ پر کیسا کچھ لکھا ہے۔ اگر انصاف
کیجئے۔ تو ایسی کتاب اردو میں آج تک کوئی نہیں ہوئی۔ اردو کو رتبہ فارسی کا بخشا ہے،
اردو نویسوں کو سامان انشا پردازی کا عطا کیا ہے۔ اس کی بدولت ہر ایک اردو نویس
اب ایسا منشی بنتا ہے کہ فارسی استادوں کو ان کے آگے سکتا ہے۔ ان میں سے کب
کوئی ویسا لکھ سکتا ہے۔ بلکہ یہ کتاب اردو نویسوں ہی کے حق میں مفید مطلب نہیں ہے
ہر ایک قاعدہ اس کا فارسی والوں کے حق میں بھی اکسیر کا نسخہ ہے۔ مصنف نے جو اس
کتاب کی تصنیف عاجز کی تکلیف دینے سے اختیار فرمائی۔ میری زبان میں کیا تاب و
تواں ہے کہ اس کا شکر ادا کروں۔ یہ تقریظ تو کیا اگر دفتر لکھوں ایک حرف ادا
نہ ہو۔ اس لئے دعا پر ختم کرتا ہوں۔ الٰہی! جب تک معنی سخن میں۔ اور سخن حرف میں۔
حرف خط میں۔ اور خط جانِ قالب کتاب میں ہے۔ دانشمندوں کا تعویذ جان اس
کتاب کا ہر ایک باب ہو۔ یہ دعا بیخبر کی مستجاب ہو۔

نوابِ عبدالعزیز خاں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہر چند یہ دنیا جسے ہم طلسم حیرت کہتے ہیں خود ایسی بے بنیاد ہے کہ نقش برآب اس سے زیادہ استوار ہے کسی عبارت سے اس کی بے ثباتی بیان ہو سکے دشوار ہے کسی لفظ سے اس کی تعبیر ہو دور از کار ہے جس وقت ہم اس کی بے بقائی لکھنے کو قلم اٹھاتے ہیں جب تک خامہ ہاتھ سے صفحہ تک پہنچے وہ وقت خود باقی نہیں رہتا پھر لکھا جائے تو کیونکر لکھا جائے جس دم ہم اس کا فانی ہونا بیان کیا چاہتے ہیں اتنے میں کہ بات دل سے زبان تک وہ گھڑی آپ ہی فنا ہو جاتی ہے کچھ کہا جائے تو کیا کہا جائے جس تماشے کو ہم دیکھ رہے ہیں پلک جھپکی اور وہ بدل گیا جس ہنگامہ کی سیر سے ابھی ہم سیر نہیں ہوئے ہیں نظر پھری اور کچھ کا کچھ ہو گیا جو کارخانہ خود ایسا ناپائدار ہو وہاں کون سی شے کسی کی یادگار ہو مگر اس پر بھی اگر کوئی چیز گذشتوں کی یاد دلانے والی اور آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں ان کو دھیان میں لانے والی ہے تو سخن ہے یہی آتش کارواں ہے یہی نقش قدم رفتگاں ہے اسی سے ہمیں کچھ اُن کا پتہ لگتا ہے جو کل مالک وجاہ و املاک تھے اور آج زیر خاک ہیں اسی سے ہمیں کچھ ان کا سراغ ملتا ہے جو کل موجبِ زینتِ انجمن تھے اور آج باعثِ ماتم و محن ہیں اسی سے گزرے ہوؤں کا حال ہم پر ایسا واضح ہوتا ہے کہ گویا وہ کہہ رہے ہیں اور ہم اپنے کانوں سے سُن رہے ہیں اسی سے آنے والوں کو ہماری کیفیت ایسی روشن ہو گی کہ جیسے ہم ان کے سامنے ہیں اور وہ اپنی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہے ہیں۔ چنانچہ یہ دیوان جس کا ہر مصرعہ چمنستانِ فصاحت کا سروِ چمان ہے جس کی ہر بیت کشورِ بلاغت کا قصرِ فلک نشان ہے بلکہ ہر لفظ معانی نادرہ کی ایک کتاب ہے

ہر حرف مضامین نایاب کا باب ہے ہر ورق ایک قلزم ہے جس میں غوّاص فکر کو درِ ثمین ملتے ہیں، ہر صفحہ ایک معدن ہے جس سے طرح طرح کے جواہر رنگین نکلتے ہیں اُن کا یادگار ہے جو سلف کے یادگار اور خلف کے افتخار تھے یعنی جامع علوم ماہر فنون انسانِ کامل عزیز ہر دل نواب عبدالعزیز خاں مغفور اللہ اکبر کیسی استعداد خداداد ذہن رسا فکر بجا تھی جس کا ادنیٰ نتیجہ یہ دیوان ہے۔ ان کے تبحّر علمی کے اعتبار سے جو اُن کی اور تصانیف سے ثابت ہے شاعری اُن کے لیئے دون مرتبہ تھی اور ادھر کم توجہ فرماتے تھے اُس پر یہ جو کچھ کہا ہے ایسا کہا ہے کہ کوئی کہہ نہیں سکتا اسے دیکھ کے سخن شناسوں کو حیرت ہے کہ جن مضامین تک خاقانی اور انوری کے دستِ فکر نہ پہنچے وہ ان کے ہاتھ کہاں سے آئے اور پھر اس کثرت سے۔ معنی فہموں کو عبرت ہے کہ جن مطالب کی تلاش میں فصحائے عرب و عجم نے جان دی اور ناکام رہے وہ انہیں اس قدر کیوں کر ملے، اور پھر اس ندرت سے اللہ اللہ کل کی بات ہے کہ وہ منتخب روزگار بزم احباب میں باعثِ افتخار علم و فضل میں لوگوں کے مقتدا ہنر اور کمال میں ہر فن کے پیشواؤں کے پیشوا خلق۔ حلم۔ ہمت۔ مروت محبت۔ فتوت۔ استقلال۔ استقامت۔ پاس۔ وضع۔ حفظ مراتب میں مشہور عالم۔ ذہن۔ ذکاوت۔ حافظہ۔ عقل۔ فہم۔ دور اندیشی۔ پیش بینی۔ معاملہ فہمی میں محسود بنی آدم تھے۔ آج آفتاب زیر زمیں اور بہشت میں حوروں کے ہمنشیں ہیں۔ وہ تو یہاں بھی اچھے تھے اور وہاں بھی اچھے ہیں افسوس اور رونا تو ہمیں اپنے حال پر ہے کہ وہ دولت ہمارے ہاتھ سے جاتی رہی اگر لاکھوں برس آسمان چکر کھائے تو اس کا ملنا ممکن نہیں بس بہتر اس بیان سے زیادہ دل نہ دکھاؤ کبھی اس یادگار کو اپنے زخم جگر کا پھاہا بناؤ اور کبھی اس شعر کو عمل میں لاؤ۔

دل ہمارا ہے مرقع صحبتِ احباب کا
بیٹھ کر کے دو گھڑی جی انہیں بہلا لیتے ہیں

دیوان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

راستی ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا خالق بھی (جس کے حمد سے ہماری زبان الکن، ہمارا بیان بے سروپا ہماری تقریر ناقص ہمارا کلام نارسا رہے) اس کو پسند کرتا ہی یہ ایک ایسی صفت ہی کہ ممدوحِ خدا بھی جس کے نعت سے ہمارا نطق ابکم ہمارا ذہن عاجز ہماری عقل حیران ہمارا فہم قاصر ہے اس کی مدح فرماتا ہی زبان اور قلم کو خالق اشیا نے وقت خلقت ہی ہیئت میں راست اس لیئے بنایا کہ سخن میں اپنی ہیکل کے موافق راستی اختیار کریں کجی کو عیب جانیں۔ پھر اگر کوئی اسے اپنا شعار کرے تو منصف مزاجوں کو چاہیئے کہ اس کی راست گوئی کی داد دیں، نہ یہ کہ اُسے مبالغہ سمجھیں کیا کوئی خورشید کو روشن بہار کو مشاطۂ شاہد چمن۔ آسمان کو بلند صاحب درہم و دینار کو دولت مند، زمین کو بسیط سمندر کو محیط، مشک کو معطر شمع کو منور پھول کو نازنین قند کو شیریں، گوہر کو آبدار جوہر کو تابدار آئینہ کو مجلّا مصقل کو مصفٰے کہے تو کوئی اسے مبالغہ جانے گا نہیں، ہرگز نہیں سب کہیں گے امر حق کا اظہار کرتا ہے جب یہ مسئلہ مسلّم ٹھہرا تو پھر جس کو خداوند کریم نے مالکِ ملکِ سخن بنایا ہو اگر ہم اس کو یہ کہیں کہ شاعری میں اپنی نظیر آپ ہی ہیں تو کیا جھوٹ ہے جب دوسرا ایسا پیدا ہی نہ ہوا ہو تو یکتا نہ ہو کیا ہو اگر ہم انھیں یہ سمجھیں کہ سخن سنجی میں خود ہی اپنے عدیل ہیں تو کیوں کر سچ نہیں ہے جب کوئی ایسا وجود ہی میں نہ آیا ہو تو پھر ہمتا نہ ٹھہرے کیا ٹھہرے ان کے کلام میں فصاحت کی کثرت پر نظر کریں تو بے تامل کہہ سکتے ہیں کہ یہ صفت جتنی پیدا ہوئی ہے سب انھیں کو دے دی گئی بلاغت کی افراط جب خیال میں لائیں تو بلاشک یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ یہ نعمت جس قدر خلق کی گئی تمام انھیں کے حوالہ ہو گئی اس

قول کو کس وجہ سے یہ خیال کیا جائے کہ یہ مبالغہ کرتا ہے یا اپنے اتحاد اور ارتباط قدیمی کی پاسداری بنا ہنا ہے یہی کیوں نہ سمجھا جائے کہ پلّے سرے کا راست گو ہے کیسی سچی بات کہتا ہے خصوصاً جب اس صداقت بیان پر اُس کے ایک شاہد عادل اور گواہ صادق موجود ہو وہ کون اس کا دیوان جواب تک خلوت خانہ خفا میں تھا اور اب بمصداق ؎

نکو رُو تاب مستوری ندارد چو در بندی سر از روزن بر آرد

بزم اظہار میں آیا ہے یعنی چھپ گیا ہے۔ اب تک مشکل یہ تھی کہ ایسے شاہد زیبا کا نظارہ حاصل ہونا آسان نہ تھا اور اب تو اُس نے اپنے جمالِ جہاں آرا پر سے نقاب اٹھا دیا ہی شہرت کا غازہ چہرہ پر ملا ہے دیدار کے طالبوں کو صلائے عام ہے کہ آویں اُس کی نور آگیں صورت سے آنکھیں روشن کریں اور دیکھیں کہ کیا ہے جو اس میں نہیں ہے۔ زبان ایسی کہ سلاست اس پر فدا بیان ایسا کہ حسن اس پر شیدا مضامین ایسے بلند کہ عرش سے نیچے ان کا مقام نہیں الفاظ ایسے دل پسند کہ معشوقوں کی طرح ان کے دل رُبا ہونے میں کچھ کلام نہیں۔ ترکیب میں چستی بندش میں درستی مضامین میں جدّت استعاروں میں ندرت ہر بات میں ایک نئی بات ہر نکتہ میں کچھ اور ہی گھات' تب تو میرے کہنے کا یقین آئے گا غور سے دیکھو تو یہاں شاہد سخن کا جلوہ ہی کچھ اور ہے اُس نازنین کے اداؤں کا کچھ اور ہی طور ہے ؎

دلربا جتنے ہیں دل لیتی ہے سب کی شوخی ہے مگر آپ کی شوخی تو غضب کی شوخی

کرشمہ ہے تو دلربا غمزہ ہے تو روح فرسا عشوہ ہے تو جگر دوز شوخی ہی تو فتنہ آموز ادا ہی تو قیامت زا انداز ہے تو حسرت افزا تبسم ہے تو تمکین تکلم ہے تو شیریں نگاہ ہے تو تیر اشارہ ہے تو شمشیر صفحوں کی سفیدی نہیں چاندنی چھٹکی ہوئی ہے جس کے سیر سے جی ہی سیری نہیں آتی حرفوں کی سیاہی نہیں سرمۂ تسخیر ہے کہ

جہاں نگاہ پڑی پھر وہاں سے اٹھائی نہیں جاتی ہر شعر کو جی چاہتا ہے کہ وظیفہ کی طرح پڑھا کیجیے ہر مصرعہ ایسا دل میں گڑ جاتا ہے کہ بس اسی کو ورد صبح و مساء کیجیے۔ ؎

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

میری یہ دعا ہے کہ خدا سخن فہموں کو اس کے قدر کی دولت عطا کرے اور حاسدوں کے چشم بد سے اسے بچائے۔ فقط

ایک خط

منشی ممتاز علی خاں

جناب مرزا نوشہ صاحب کے نثر کا مجموعہ مرتب کر کے آج مصنف صاحب کے حوالہ کیا ہے، غازی الدین حسین خاں صاحب کے پاس بھیجدیں اور وہ آپ کی خدمت میں روانہ کریں مصنف آپ کے بہت قریب ہیں ایک نظر ان کو بھی دکھا لیجیے، تب چھپوانا شروع کیجئے تو بہتر ہے، فقیر نے اس کے ترتیب دینے اور لکھوانے اور بذات خود مقابلہ کرنے ہی میں محنت نہیں کی بلکہ اتنا تردد اور کیا کہ جو رقعات بریلی سے آئے ہوئے غلط لکھو دیئے ان کو وہاں سے مکرر منگوایا اور سوائے اس کے گورکھپور۔ لکھنؤ کانپور سے کچھ بہم پہنچایا اور نئی نثریں مصنف سے اور لیں۔ اور ان سب کو بھی مجموعہ میں داخل کیا اور جہاں کہیں شک ہوا مصنف سے اس کی تصحیح کر لی۔ اب اگر یہ مجموعہ طاق نسیاں پر رکھا نہ رہے اور جلد چھپے تو مصنف پر احسان ہوگا۔ فقیر کے پاس تو اصل موجود ہے جب دیکھے گا کہ آپ نہیں چھپواتے تو اپنے کاتب سے ایک نسخہ اور لکھوا لے گا اور جو نقل کے طالب ہوں گے ان کو دے دے گا۔

تمام شد

نقل عکس تحریر حضرت بجنسہ

عزیز گرامی منشی مرزا قمرالدین صاحب زاد اللہ قدرکم

میں نے ہر چند قصد کیا کہ میں ان اخباروں اور جنتری کو دیکھوں جن میں حضرت سیدنا امیر ابوالعلا صاحب قدس سرہٗ کے درگاہ عالم پناہ واقع اکبرآباد کی نسبت مضامین اور مباحثے چھپے ہیں مگر افسوس ہے کہ مجھے اوس کی فرصت نہ ملی اور میں مجبور رہا۔

راقم

فقیر غلام غوث پنشندار میر منشی
محکمہ عالیہ گورنمنٹ ممالک مغربی وشمالی و
اودھ ملقب بہ خواجہ ومخاطب بہ خطاب
خان بہادر ذوالقدر از سرکار دولتمدار انگلشیہ
۷رجون ۱۸۹۵ء مقام الہ آباد

نوٹ :۔ اصل خط ملک ڈاکٹر مرزا سعید الدین احمد
سجادہ نشین درگاہ امیر ابوالعلا احراری رح

ہم سے طلب کیجئے:

جامعہ اُردو، علی گڈھ
مُسلم یونی ورسٹی، علی گڈھ

کے نصاب کی جملہ کتب

اُردو کی تاریخی، ادبی، تنقیدی، شعری
کے علاوہ ناول، افسانے وغیرہ
اور
ادب اور سوانحی کتابیں طلب فرمایئے

پاکستانی کتابوں اور رسائل کے لئے یاد کیجئے

ادبی دُنیا، ڈگی روڈ، علی گڈھ ۶